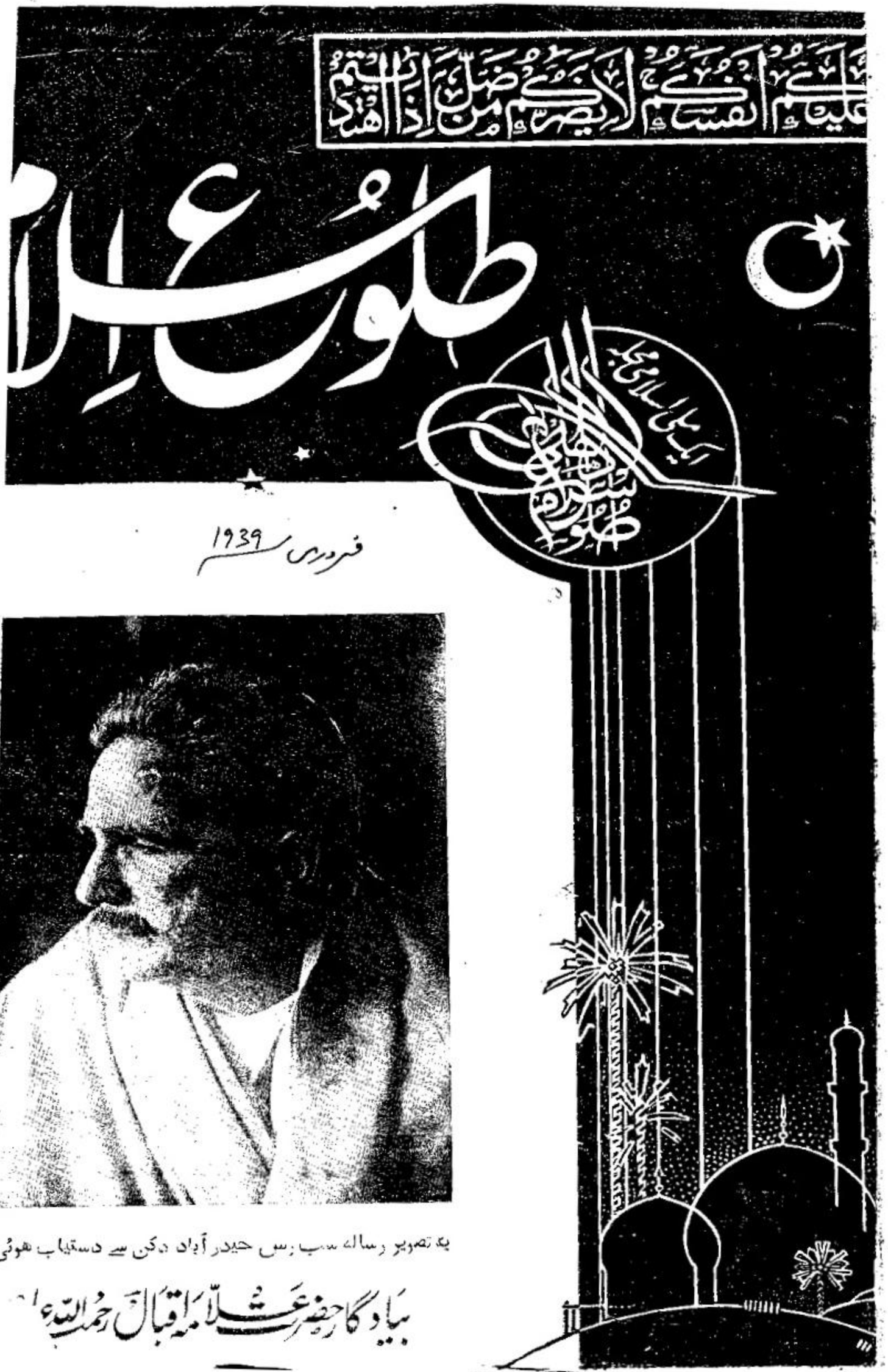

عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

ایک ملی اسلامی مجلہ

فروری ۱۹۳۹

یہ تصویر رسالہ سب رس حیدر آباد دکن سے دستیاب ہوئی

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب

محمد ظہیر الدین صدیقی بی ایس سی

جلد (۲) شمارہ ۱۰

بدل اشتراک :-

پانچ روپیہ سالانہ فی پرچہ ۸/

ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ بابتہ فروری سنہ ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

۱	لمعات	ادارہ	۳ تا ۱۱
۲	تنقید و تبصرہ	ادارہ	۱۲ تا ۱۶
۳	واردھا کی تعلیمی اسکیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ	جنابِ رازی	۱۷ تا ۳۷
۴	حقایق و عبر		۳۸ تا ۴۴
5	بصائر		۴۵ تا ۴۷
۶	عید قرباں	جناب اسد ملتانی	۴۸
۷	حضرت علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات	جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۴۹-۵۵
۸	پیامِ اقبال و قرآن کریم	"	۵۶ تا ۶۴
۹	خطاب مسلم لیگ	حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی	۶۵-۶۷
۱۰	اسبابِ زوال امت	جناب مولانا اسلم صاحب جیراجپوری	۶۸-۷۸
۱۱	جمیعۃ علماء ہند کا اجلاس	ادارہ	۷۹-۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرکزِ ملت ← [لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ] → مرکزِ ملت

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

اِعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا — اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ

اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو — بات مانو اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کیطرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکزِ مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا — جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !

عَلَیْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ — لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ

(فرمانِ رسول) — (قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

لمعات

ہندی سیاست کی نمائش گاہ میں وہ سادہ چک آج تک ایک ممتاز جگہ پر آویزاں نظر آتا ہے جو گول میز کانفرنس کی "یاترا" کے وقت مہاتما گاندھی نے از رہِ ترحم خسروانہ مسلمانوں کو عطا فرمایا تھا۔ اور جو اسوقت تک بغیر وصولیابی کے (Un-cashed) رکھا ہے کہ آنند بھون کا خزانہ عامرہ اسکی رقمِ خطیر کا متحمل نہیں ہو سکا۔ اس عطیہ کو چونکہ ایک عرصہ گزر چکا تھا اس لئے مہاتما جی کے ابرِ کرم نے پھر عزم گہربار فرمایا ہے اور بار دولی کے محکمۂ مالیات میں ایک اور گراں بہا خریطہ تیار کیا جا رہا ہے جو مسلمانوں کی "دینی اور دنیاوی" ضروریات کا کفیل ہو سکیگا۔

ہم مہاتما گاندھی کی اس "شفقتِ بزرگانہ" اور ارباب کانگریس کے اس جذبہ ہمدردی کے شکر گذار ہیں جو مسلمانوں کے لئے ان کے سینہ میں موجزن رہتا ہے۔ اور جس کی بنا پر وہ انکی مشکلات کا حل سوچنے میں دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر لیتے ہیں۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں باادب گذارش کرینگے کہ یہ بچہ بدقسمتی سے اب اس عمر سے آگے بڑھ گیا ہے جس عمر میں اسے "جھنجھنا" دیکر بہلایا جا سکتا تھا۔ اب اگر یہ حضرات اس مشکل کا واقعی سنجیدگی سے حل سوچنا چاہتے ہیں تو انہیں حقائق سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ ان کا اعتراف کر کے مردانہ وار ان کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ ہم ان صفحات پر متعدد مرتبہ اس امر کا اظہار کر چکے ہیں کہ مسلمان اپنے مذہب کی رُو سے مجبور ہے کہ وہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے رہے۔ وہ کسی مخلوط جماعت اور متحدہ قومیت کا جزو نہیں بن سکتا۔ یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے اور جب تک اس اصول کو سامنے نہ رکھا جائیگا۔ ہندی سیاست کی گتھیاں کسی صورت میں بھی سلجھ نہیں سکینگی۔ اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بین الاقوامی حیثیت سے مصالحت اور مفاہمت ہو سکتی ہے نہ اس حیثیت سے کہ تمام اہل ہند کو ایک قوم فرض کر کے مسلمانوں کو ایک فرقہ قرار دیا جائے۔ اس موضوع پر ہم جولائی ۳۸ء کے پرچہ میں جناب رازی کا ایک

بصیرت افروز اور پر مغز مقالہ بعنوان "گفتگوئے مصالحت" شائع کر چکے ہیں جس میں حقائق و دلائل سے واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے بنیادی مطالبات کیا ہیں اور وہ ان مطالبات کو کیوں نہیں چھوڑ سکتے یہ مضمون الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا گیا تھا جس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا اور اسکی اہمیت کے پیش نظر دوسرا ایڈیشن بعنوان "لیگ کا بنیادی مطالبہ" پھر شائع کیا گیا ہے۔ جو حضرات ہندوستان میں مسلمانوں کی صحیح پوزیشن اور ان کے قومی مطالبات کی حقیقت سے آگاہی چاہتے ہوں وہ اس پمفلٹ کا ضرور مطالعہ کریں۔ کہ جب تک کسی مسئلہ کے بنیادی اصولوں سے واقف نہ ہوا جائے اسکی تفصیلات کما حقہ سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

کانگریسی ہندو حضرات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو ایک الگ قوم اور اس لئے مسلم لیگ کو انکی نمائندہ جماعت کسطرح تسلیم کرلیں جب کہ خود مسلمانوں کے قومیت پرست حضرات ان دعاوی کے خلاف کانگریس کے ساتھ شامل ہیں۔ لیکن یہ کہتے وقت وہ اتنا نہیں سوچتے کہ ہندوؤں میں ابھی تک ان لوگوں کی کمی نہیں جو انگریزوں کے ساتھ ہیں اور اسطرح کانگریس کے دعاوی اور مطالبات کے عملاً خلاف ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کے باوجود ہندو اپنے مطالبات میں حق بجانب ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ چند قومیت پرست حضرات کے کانگریس میں شامل ہو جانے سے مسلمانوں کا وہ مطالبہ جو ان کے مذہب پر مبنی ہے۔ کسطرح ناقابل تسلیم ہو جائیگا؟ ہمیں ان مسلم قومیت پرست حضرات کی مجبوریوں کا بھی احساس ہے۔ لیکن وہ غالباً اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ انسان منزہ عن الخطا نہیں۔ اس سے غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے غلطیوں سے رجوع کرنے والوں کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ غلطی کر جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن غلطی کے احساس کے بعد اس کا اعتراف یہ عزم الامور میں سے ہے۔ اس کے لئے تھوڑی سی جرأت درکار ہے اور بس۔

سندھ کے وزیر اعظم خان بہادر اللہ بخش نے پچھلے دنوں قلمدان وزارت کے تحفظ کے لئے جو کروٹیں بدلی ہیں وہ قلب انسانی کے جذبہ جاہ پرستی کی ایک ناقابل فراموش یادگار ہے انہوں

نے اپنی پارٹی کو چھوڑ کر پہلے بمبئی میں سردار پٹیل سے نامہ و پیام شروع کیا۔ جب سندھ میں لیگ کا زور ہوا تو مسٹر جناح کی بارگاہ میں شرفِ باریابی حاصل کیا۔ وہاں کی کڑی شرائط کی تاب نہ لا سکے تو پھر بمبئی کی طرف رجوع کیا۔ وہاں سے معلوم نہیں کیا جواب ملا کہ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر واردھا پہنچے۔ وہاں سے لوٹے تو گورنر کے حضور میں حاضر ہوئے۔ وہاں بھی خاطر خواہ پناہ نہ ملی تو پھر عہدوں کا لالچ دیکر اپنی پارٹی کو مضبوط کرنیکی تجویز کی۔ اس کے بعد اب پھر کانگریس سے سلسلہ گفت و شنید جاری کیا گیا ہے۔ غرضیکہ محملِ لیلائے وزارت ہے اور جناب وزیر اعظم کی دشت پیمائیاں صحرا نوردیاں اور جبہ سائیاں

می تراشد فکرِ او ہر دم خداوندے دگر ۔ رست از یک بندنا افتاد در بندے دگر

خودی کی موت سے انسان کی یہی حالت ہو جاتی ہے کہ وہ۔ ایں سوراندہ و آں سو در ماندہ۔ مارا مارا پھرتا ہے کبھی اس دروازہ پر جھولی پھیلائے نظر آتا ہے کبھی اس پر کبھی اس سے ساز باز کرتا دکھائی دیتا ہے کبھی اس سے۔

گاہ اورا با کلیسا ساز باز ۔ گاہ پیشِ ویریان اندر نیاز

دینِ او آئین او سوداگری است ۔ عنتری اندر لباسِ حیدری است

ہم اپنے اس فریب خوردہ بھائی کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی ۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

حال ہی میں "آل پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن" کا اجلاس زیر صدارت خان عبد القیوم۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ لاہور میں منعقد ہوا جس میں ایک ریزولیشن اس مفہوم کا بھی پاس کیا گیا کہ سرکاری ملازمتوں میں فرقہ دارانہ تناسب کو مٹا کر صرف قابلیت کے معیار پر انتخاب کیا جائے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ معیارِ انتخاب واقعی قابلیت ہونا چاہیئے۔ لیکن جن برخورداران نے یہ ریزولیشن پاس کیا ہے انکی قابلیت کی تو یہ حالت ہے کہ مقابلہ کے امتحانوں میں دور دور بھی ان کا نام نظر نہیں آتا۔ اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات چھوڑیئے۔ حکومت ہند کے دفاتر کی کلرکی کے امتحانات میں دیکھیئے۔ فہرست نتائج میں ابتدائی صفحوں

کے صفحے الٹتے جایئے۔ کہیں مسلمان کا نام دکھائی نہیں دیگا۔ ان کے نام خیر سے نیچے سے شروع ہونگے یہ تو ہے اِن مسلمان نوجوانوں کی قابلیت اور اس پر قرارداد منظور کی جارہی ہے کہ معیار انتخاب قابلیت ہونا چاہیئے۔ اپنے اندر مقابلہ کی ہمت پیدا کیجیئے۔ معیارِ انتخاب خود بخود درست ہو جائینگے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

ان ناتجربہ کار نوجوانوں کو کیا معلوم کہ اِنکی موجودہ قابلیت کے پیش نظر اس قسم کی قرارداد یں کیا معنی رکھتی ہیں۔ اس کی بابت تو ان کے غریب ماں باپ سے پوچھیے جو اپنا پیٹ کاٹ کر ان کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ اور پھر ان صاحبزادوں کے جذبہ حریت کو بے نقاب دیکھنا ہو تو وہ منظر آنکھوں کے سامنے لایئے جب یہ مقابلہ کے امتحان میں فیل ہو جانے کے بعد تعارفی چٹھیاں ہاتھ میں لئے کسی صاحب بہادر کی کوٹھی کا طواف کرتے اور ان کے بہروں اور خانساموں کی خوشامد کرتے نظر آتے ہوں اس وقت یہ تمام قراردادیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

ہم اپنے ان عزیزوں پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حقیقی خودداری کے لئے اپنے اندر جوہر ذاتی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ مسلمان کی تو شان یہ تھی کہ

مومنے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او برنتابد ہمسرے

لیکن جس قسم کے "مومن" ہمارے کالجوں سے پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ کس سے پوشیدہ ہیں پہلے کالجوں سے اس قسم کے فولادی سیرت رکھنے والے نوجوان پیدا کیجیئے۔ پھر اس قسم کی قراردادیں بھی پاس کر لیجیئے گا۔ ورنہ آج تو یہ حالت ہے کہ

بآدمے نہ رسیدی خدا چہ می جوئی!

اور ہم ان کانگریسی حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں جنکی زیر سرپرستی یہ قرارداد منظور کی گئی ہے کہ اگر ملازمتوں میں فرقہ وارانہ تناسب ایسا ہی شجر ممنوعہ ہے تو گذشتہ موسم گرما میں جب اسمبلی میں فوجی بل پیش ہوا ہے تو بڑے بڑے کانگریسی حضرات فوج کی ملازمت میں فرقہ وارانہ تناسب کے لئے اس

درجہ مضطرب و بیچین کیوں ہو رہے تھے! مسلمانوں کے لئے ملازمتوں میں فرقہ دارانہ تناسب حرام اور ہندوؤں کے لئے فوجی ملازمت میں ایسا تناسب حلال وطیب!

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

غالبؔ مرحوم نے ایک خط میں لکھا ہے کہ ہجوم مصائب سے گھبرا کر میری حالت یہ ہو گئی ہے کہ میں نے غالبؔ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جب کوئی نئی آفت آتی ہے تو یہ کہہ کر خوش ہو لیتا ہوں کہ اچھا ہوا غالبؔ کے ایک اور چپت لگی۔

مسلمانوں کی بھی بالعموم آج کل یہی حالت ہو رہی ہے۔ جس کسی سے بات کرو وہ کہہ دیتا ہے کہ میاں! مسلمان کرتے کیا ہیں! یہ تو بے عمل نکموں کی جماعت ہے۔ نہ ان میں ایثار ہے نہ قربانی۔ نہ عزم نہ استقلال ان میں یہ عیب ہے وہ برائی ہے۔ اور ایسا کہتے وقت وہ قطعاً خیال نہیں کرتے کہ یہ سب کچھ وہ خود اپنے متعلق کہہ رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کو اس طرح "اپنا غیر" سمجھ رہے ہیں جس طرح غالبؔ نے سمجھ رکھا تھا۔ یاد رکھئے! یہ باتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن میں جذبۂ عمل موجود نہیں ہوتا لیکن وہ اتنا کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لینا چاہتے ہیں کہ بے عمل دوسرے لوگ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم میں نقائص ہیں۔ کمزوریاں ہیں۔ لیکن ان کا علاج یہ نہیں کہ ان پر خالی تنقید کر دی جائے۔ بلکہ صحیح علاج یہ ہے کہ ہر شخص یہ تہیہ کر لے کہ یہ نقائص میں نے دور کرنے ہیں۔ اور قوم میں جس چیز کی کمی ہے وہ میں نے پوری کرنی ہے۔ یہ جذبہ لے کر اٹھ کھڑا ہو۔ اور اپنے نظام اجتماعی کا ایک فعّال پرزہ بنکر اپنے جوشِ عمل اور اطاعت صادقہ سے ساری مشینری کو حرکت دیدے یہ ہے صحیح طریق کار کہ۔

خیز و خلاقِ جہان تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
از گلِ خود آدمے تعمیر کن — آدمے را عالمے تعمیر کن

ایران میں انیگلو پرشین آئل کمپنی جب سے قائم ہوئی ہے اسوقت سے انگلستان کی بڑی ضروریات پٹرول کی اسی کمپنی سے پوری ہوتی ہیں۔ خاص کر عالمگیر جنگ میں اس آئل کمپنی سے برطانیہ کو جس قدر جنگی ضرورتوں میں امداد ملی ہے وہ محتاج بیان نہیں جبکہ تمام دوسری حریف سلطنتوں میں پٹرول کی سخت کمی تھی برطانیہ میں اس کی افراط تھی۔ ادھر چند سال سے ایران میں تیل کے جدید چشمے دریافت ہوئے۔ ترکی ماہرین نے انکو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ ان سے اسقدر پٹرول حاصل کیا جاسکتا ہے جس سے ترکی کی جملہ ضروریات پٹرول کی پوری ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ ترکی حکومت نے ایرانی حکومت سے اسکے اجارہ کے معاملہ کو طے کیا اور انیگلو پرشین آئل کمپنی کے مقابلہ میں ترکی پرشین آئل کمپنی قائم ہوئی۔ حال میں ترکی انجینیر اسکے کام کو جاری کرنے کیلئے ایران آگئے ہیں اور عنقریب اسکے افتتاح کی رسم ادا کی جائے گی۔

ترکی میں پٹرول کی بہت کھپت ہے جسکے لئے وہ ہمیشہ سے روس اور نیز دیگر سلطنتوں کی محتاج رہی ہے۔ امید ہے کہ اس کمپنی کے اجراء کے بعد اسکو کسی بیرونی ملک سے پٹرول منگانے کی ضرورت نہ رہے گی۔

حکومت ایران کا خیال یہ ہے کہ آئندہ کے لئے وہ تمباکو کی درآمد کیواسطے یوروپین کمپنیوں کے اجارے توڑ کر صرف ترکی سے معاملہ کرے اسطرح پر پیٹرول کے معاملہ میں ترکی اور تمباکو کے معاملہ میں ایران اجنبیوں کی دست برد اور احتیاج سے آزاد ہوجائینگے۔ اور دونوں ملکوں پر اس کا اقتصادی اثر نہایت عمدہ پڑیگا۔

عنوانات بڑے نیک ہیں کہ ایک مدت کا بھٹکا ہوا راہی قران کریم کے ان مقامات کی طرف پھر سے آرہا ہے کہ

جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن

(اقبال)

Page Missing

ریاست حیدر آباد کے خلاف آجکل جو شورش برپا کی جارہی ہے اس کے متعلق ہمارے پاس استفسارات بھی پہنچے ہیں۔ اور بعض احباب نے اس کے متعلق اظہار خیال کے لئے بھی لکھا ہے۔ طلوع اسلام نہ ہنگامی واقعات سے متاثر ہوتا ہے، اور نہ ہنگامی طور پر کچھ لکھتا ہے۔ اس کے سامنے ایک واضح غیر مبہم اور روشن نصب العین ہے اور اس کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف بڑھتا ہے ریاست حیدر آباد۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کا مسئلہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور ہم اس کی بابت قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کئی ایک اور امور کی طرح عدم گنجائش اس باب میں بھی تعویق کا باعث بنتی چلی آرہی ہے۔ اس لئے ہم مستفسرین کی "بیتابی تمنا" کے پیش نظر یہ چند سطور ایجازاً لکھنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

حیدر آباد مسلمانوں کی ریاست ہے اور اس نکبت و زبوں حالی کے زمانہ میں جبکہ مسلمانان ہند پر خدا کی یہ وسیع و عریض زمین تنگ کی جارہی ہے۔ اتنی بڑی ریاست پر جو یورپ کی کئی ایک سلطنتوں سے بھی وسیع ہے۔ مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہوگا کہ اس دور لامرکزیت میں حیدر آباد جیسے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کا زندہ اور جیتا جاگتا مرکز بننا چاہیئے تھا وہ بحالت موجودہ اسلام کے منتشر نظام کی بکھری کڑیوں میں ایک اہم کڑی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ مرکزی حیثیت سے مسلمانوں کا امیر جماعت سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہیں ہو سکتا۔ وہ ان ہی میں چلتا پھرتا ہے۔ ان ہی میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ مسجد میں ان کا امام۔ منبر پر ان کا خطیب، ایوان سیاست میں ان کا مشیر کار اور صف خبگاہ میں ان کا سپہ سالار رہوتا ہے۔ غرضیکہ وہ ایک ایسا مرکز ہوتا ہے جس کی کشش سے تمام منتشر ذرات ایک نظام سے وابستہ ہو کر ایسی محکم چٹان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس سے ٹکرا کر حوادث زمانہ کا بڑے سے بڑا طوفان بھی خاسر و نامراد لوٹ جاتا ہے ہندوستان میں جو پوزیشن حیدر آباد کو حاصل ہے اس کا تقاضا تھا کہ وہ مسلمانان ہند کے ہر معاملہ میں ان کی امامت و نیابت کرتا اور دینی اور دنیاوی تمام امور میں ان کا ایک ایسا امیر ہوتا جس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت

بن جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم دیکھتے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کس طرح اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے۔ لیکن اس تلخ حقیقت کے اظہار سے ہمیں صدمہ ہوتا ہے کہ ابھی تک ایسا نہیں ہوا اس میں شبہ نہیں کہ حیدرآباد کی طرف سے متعدد تعلیمی درسگاہوں، اسلامی اداروں، مصنفین، ادبار، علمار حضرات کو وظائف دیئے جاتے ہیں۔ خود حیدرآباد میں کتب اسلامی کے تراجم و تصنیف کا شعبہ قائم ہے۔ علم و ادب کی بڑی خدمت ہوتی ہے۔ لیکن اس قسم کی "اسلامی خدمات" سے تو ان ملکوتی اور جبروتی نتائج کا تصور تک بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ جو امت کی مرکزیت سے مترتب ہو سکتے ہیں۔ لہذا ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ جو کام آج سے بہت پہلے ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن نہ ہوسکا اس میں مزید تاخیر نہ کی جائے، حضور نظام آگے بڑھیں۔ نظام ریاست کو خلافت راشدہ کے اسلامی خطوط پر متشکل فرمائیں۔ مسلمانان ہند کی امارت اپنے ہاتھ میں لیں۔ اور اپنے عمل سے مسلمانوں کو یہ بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلائیں کہ ؎

ایک ہوں سارے حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

ہمارا یہ مشورہ کسی ہنگامی مصلحت کوشی کی بنا پر نہیں۔ بلکہ یہ مشورہ عین اسلامی مسلک کے تقاضے کی رو سے پیش کیا گیا ہے۔ کہ ہماری تمام ہنگامی اور مستقل مصائب کا حل صرف اسی ایک مسلک کے اندر پوشیدہ ہے وَلٰکن اکثرھم لا یعلمون

باقی رہا یہ سوال کہ مخالفت کے موجودہ ہجوم میں مسلمانان ہند پر کیا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ تو یہ مسئلہ بالکل واضح ہے۔ یہ تو پھر مسلمانوں کی ایک ریاست کا معاملہ ہے۔ اگر کسی غریب نادار مزدور مسلمان کو اس لئے ستایا جارہا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔ تو روئے زمین کے تمام مسلمانوں پر لازم آجاتا ہے کہ اس کی مدافعت میں بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار ہو جائیں۔ کہ تمام مسلمان ارشاد نبوی کے مطابق ایک جسد واحد کی طرح ہیں کہ پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آئیں اور سارے جسم پر راحت و آسائش حرام ہو جائے ع لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

ہمارا وہ مشورہ حضور نظام دکن کی خدمت میں ہے اور یہ مشورہ مسلمانان ہند کیلئے وَمَا اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ

تنقید و تبصرہ

صلوٰۃ المرسلین فی قرآن المبین یہ رسالہ میاں محمد فاضل صاحب مسلم حنیف اہل الذکر و القرآن مقیم چکوال ضلع جہلم نے مرتب کیا ہے۔ اس میں مروجہ نماز پر جو عام طور پر مسلمان پڑھتے ہیں تنقید کی گئی ہے۔ اور اصلی نماز جو بخیال مصنف قرآن کریم سے نکلتی ہے۔ اس کے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف کے خیال میں قرآن سے نماز کے رکعات کی تعداد دو سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی۔ انہوں نے اس کے ادا کرنے کا طریقہ بھی قرآن سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی اذکار، رکوع و سجود وغیرہ۔ مگر اس کتاب میں ہم کو کہیں اوقات صلوٰۃ کا پتہ نہ چلا۔ معلوم نہیں کہ کیوں اس کا بیان چھوڑ دیا گیا۔

یہ رسالہ چھ جز کا ہے اور شروع سے آخر تک محض خیالی اور وہمی دلائل سے جو ایک قدم بھی چل نہیں سکتے بھرا ہوا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اہل قرآن نے بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ اسوہ حسنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے اور صرف قرآن کو لیا ہے۔ جس سے وہ ہر ایک عمل کا طریق خود ہی متعین کرنا چاہتے ہیں اور نہیں کر پاتے۔ اگر یہی صورت ہے تو ہر شخص اپنے خیال کے مطابق اعمال کی تشکیل کریگا اور جتنے اہل قرآن ہیں وہ سب کے سب ایک ایک فرقہ بن جائیں گے۔ یہی مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی نے کیا تھا۔ انہوں نے نماز قرآنی پر چار سو صفحوں کی ایک کتاب لکھی ہے۔ جو سر تا سر ایسی قیاس آرائیوں سے لبریز ہے جن پر علم ہنستا ہے عقل روتی ہے اور دین لرزتا ہے۔

مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اہل قرآن نے آج تک یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی قرآن جو رسولؐ پر اتارا گیا ہے اور اس میں رسولؐ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ اور اگر یہ انہوں نے نہیں سمجھا تو قرآن لاکھ برس تک بھی ان کی سمجھ میں نہ آسکیگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج چالیس سال سے یہ فرقہ نکلا ہے مگر قرآن کی ایک ذرہ برابر خدمت اس سے نہیں ہو سکی۔ بلکہ اس کے افراد کی جملہ قرآنی کوششیں

اہل نظر کے نزدیک اضحوکہ سے زیادہ مرتبہ نہیں حاصل کر سکیں۔ (ا۔ ج)

جوہر اقبال

رسالہ جوہر کا اقبال نمبر جو جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے کالج کے طلباء کی انجمن اتحاد نے شائع کیا ہے۔ طباعت، کتابت، کاغذ، جلد عمدہ ۲۶۶ صفحات۔ قیمت درج نہیں ہے۔

حضرت علامہؒ کی وفات کے بعد ملک کے متعدد جرائد و رسائل نے اقبال نمبر شائع کر کے عالم اسلامی کے اس بطل جلیل کے قدموں میں اپنی عقیدت و محبت کے پھول پیش کئے۔ اور گو ہر دہ کوشش جو جذبۂ خلوص پر مبنی ہو۔ درخور صد تحسین و لائق ہزار تبریک ہوتی ہے۔ لیکن جامعہ ملیہ کے نوجوان طلباء خاص طور پر مستحق مبارکباد ہیں کہ اس باب میں ان کی کوششیں ان کی استطاعت و استعداد کے پیش نظر بڑی کامیاب رہی ہیں۔ اور انہوں نے ایسے ستھرے مضامین کی اشاعت سے اپنے حسن انتخاب اور پاکیزگی ذوق کا عمدہ ثبوت دیا ہے شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا پیام، استاذ جامعہ جناب ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا مضمون "عقل و عشق اقبال کی شاعری میں" ایک جامعی کا مضمون "اقبال۔ شخصیت اور پیام" خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ جناب مجیب صاحب کی ایک تقریر جو نشر الصوت کے ذریعہ ایکبار فردوس گوش بن چکی ہے اب اس مجموعہ کے صفحات پر جنت نگاہ بن رہی ہے۔ حضرت مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کا مضمون مثنوی اسرار خودی" گو آج سے قریب بیس برس پیشتر کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن حضرت مولانا کے مضامین چونکہ ہنگامی نہیں ہوتے اس لئے یہ شراب جتنی پرانی ہوتی جائے اتنی ہی زیادہ نشہ آور ہوتی ہے۔ حضرت علامہؒ نے اس مضمون کو پڑھ کر جو گرامی نامہ جناب مولانا صاحب کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا اس کا عکس بھی مضمون کے ساتھ شامل ہے جو ایک نادر یادگار ہے۔

لیکن یہ رسالہ زیر نظر نیز رسالہ جامعہ میں حضرت علامہ کے متعلق مضامین پڑھنے کے بعد ایک ایسا معمہ سامنے آجاتا ہے جس کا حل نہیں ملتا یعنی ارباب جامعہ کی پیام اقبال کے ساتھ اس قدر والہانہ شیفتگی اور اس پیام کے مسلک سے اس قدر بُعد! خدا کرے کہ کم از کم جامعہ کے نوجوان طلباء اس بات کو سمجھ لیں کہ اقبال کی

عظمت کا سچا اعتراف اس میں ہے کہ ان کے پیام حیات بخش کو اپنی زندگی کا مسلک قرار دیا جائے۔ نہ یہ کہ محض ان کی شاعری کی داد دی جائے۔

مسلمانوں کا ایثار اور جنگ آزادی

از عبدالوحید خاں بی اے۔ کاغذ، طباعت، کتابت متوسط ۴۵۳ صفحات قیمت عہ۔ مصنف سے ۹ لاٹوش روڈ لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

مسٹر ساورکر، صدر ہندو مہاسبھا نے حال ہی میں اپنے خطبہ صدارت (ناگپور) کے دوران میں کہا ہے کہ موجودہ جنگ آزادی میں مسلمان ایک تماشائی کی حیثیت سے رہے ہیں کہ قربانیاں اور کریں اور حصہ بٹانے کو یہ آموجود ہوں۔ کتاب زیر نظر ہر چند مسٹر ساورکر کے اس تبصرہ سے بہت پہلے کی لکھی ہوئی ہے لیکن اس میں حقائق و واقعات کی روشنی میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ تحریک آزادی کی داستان میں شوخی و رنگینی کس کے خون سے پیدا ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی قربانیوں کے ماحصل پر برادران وطن نے کس طرح سادگی و پرکاری سے چنگل مارا ہے اور اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں سے کس طرح تیور بدلے ہیں جو مسلمانوں کی موجودہ جائز بدگمانیوں کے موجب بنے ہیں۔ کتاب بڑی محنت سے لکھی گئی ہے، اور ہندوستان کی موجودہ تحریک آزادی اور اسلامی سیاست سے متعلق مفید معلومات یکجا جمع کر دی گئی ہیں۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے عقیدت اور ان کے کلام سے استفادہ، مصنف کے صحت مسلک اور شستگئ ذوق کے آئینہ دار ہیں۔

مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل

مصنفہ میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بار ایٹ لاء مدیر ہمایوں لاہور۔ حجم ۷۶ صفحہ مقام اشاعت دفتر رسالہ ہمایوں ۳۳ لارنس روڈ لاہور۔ قیمت ۶ رفی نسخہ طباعت، کتابت، کاغذ بااعتبار نفاست خود جناب مصنف کا آئینہ

مصنف نے اسلام کے بنیادی اصول توحید اور جماعت کا ذکر کرنے کے بعد اسلامی تاریخ کے مختلف

ادوار کا ذکر کیا ہے۔ اور ہندوستان کے سیاسی مدوجزر کا قصہ دہرا کر ہندو مسلم سوال کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ ہندو مسلم سوال باجے گاجے کا نہیں۔ بلکہ دو تہذیبوں کی ٹکر کا سوال ہے۔ حال کے مسائل میں مذہب، سیاست، معاش، تمدن اور تعلیم کو نمایاں حیثیت دی ہے۔ مصنف کے نزدیک موجودہ حالت تشویشناک ضرور ہے لیکن خطرناک نہیں۔ رسالہ کا پیام مسلمانوں کے لئے یہ ہے کہ وہ اپنا نصب العین یہ مقرر کریں کہ ہم اسلام کو اپنی دینی و دنیوی زندگی کی بنیاد تصور کرتے ہیں اور ہمارا مصمم ارادہ ہے کہ ہم اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اسی بنیاد پر عملاً قائم کریں یعنی مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک جماعت ہیں۔ الگ ایک قوم ہیں گو اپنی قومیت کو برقرار رکھتے ہوئے وہ ملکی بھائیوں سے مناسب تعاون کرنے کیلئے ہر وقت تیار ہیں۔

ہم جناب میاں صاحب کی خدمت میں ان کی اس رنگ میں پہلی، لیکن کامیاب کوشش پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو آج کل اسی قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے۔

حمائل شریف مترجم وحشی

قرآن شریف کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ کسی دور میں بھی ایسے حضرات کی کمی نہیں رہتی جو انتہائی محبت و عقیدت اور جذب و شوق سے اس کی خدمت میں منہمک رہتے ہوں۔ حمائل شریف کا زیر نظر نسخہ بھی اسی مسرت آفریں احساس کا نتیجہ ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں جہاں بڑے بڑے زریں رقم نامور خوشنویس حضرات ایسے گذرے ہیں اور موجود ہیں۔ جن کا جواب شاید ہی کہیں ملے وہاں اس خطۂ ارض میں بعض خواتین محترمہ بھی ایسی گذری ہیں اور موجود ہیں کہ جن کے قلم کے شاہکار نوادرات زمانہ میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں ان ہی خواتین میں دہلی کے مشہور خوشنویس منشی محمد دین کی صاحبزادی محترمہ فاطمۃ الکبریٰ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ نسخہ زیر نظر ان ہی خاتون محترمہ نے خود اپنے قلم سے لکھا اور اپنے اہتمام سے چھپوایا ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرکے انتہائی رنج ہوا کہ زمانہ طباعت ۱۳۵۲ھ میں جبکہ یہ اپنی عمر کا تمام اثاثہ اس پر صرف کر چکی تھیں کہ حالات نامساعد ہو گئے۔ اور اس نسخہ کی اشاعت کا

خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔ چونکہ خاتونِ محترمہ حضور نظام دکن کی بارگاہ سے وظیفہ پاتی ہیں اس لئے اس نسخہ کی اشاعت سے کسی قسم کی تجارت ان کے پیش نظر نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ حمائل شریف مترجم ہے اور ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جس کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اردو میں جس قدر تحت اللفظ تراجم آجتک شائع ہوئے ہیں شاہ صاحبؒ کا ترجمہ ان سب میں ممتاز ہے۔ اس ترجمے والے نسخے اب کمیاب ہو رہے تھے۔ خاتون محترمہ نے اس ترجمے کی اشاعت سے بھی ایک ایسی خدمت کی ہے جسے ارباب بصیرت بنظر استحسان دیکھیں گے۔ حاشیہ پر شاہ صاحبؒ کی تفسیر موضح القرآن کے فوائد بھی درج کئے گئے ہیں۔ کاغذ متوسط۔ جلد عمدہ اور مضبوط متن حنائی۔ طباعت میں البتہ اس نامساعدت زمانہ کے آثار نمایاں ہیں۔ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ضخامت ۸۱۶ صفحات ہدیہ فی جلد دو روپے جو بمشکل لاگت کو کفایت کر سکے گا۔ مقام اشاعت۔ مکان منشی محمد دین صاحب مفتی والان۔ تراہا بیرم خاں دہلی

مرقات القرآن و کلید مرقات القرآن

مؤلفہ مولوی محمد عبداللہ صاحب کامل ایم اے شائع کردہ انجمن ارباب ذوق لائلپور (پنجاب)

مرقات القرآن عربی سکھانے کی پہلی کتاب ہے اس میں چالیس سبق ہیں جو تمام کے تمام قرآن کریم سے لئے گئے ہیں اور قواعد صرف کے لحاظ سے ان کو ترتیب دیا گیا ہے۔ کلید میں ان اسباق کا ترجمہ اور قواعد کی مختصر تشریح کی گئی ہے۔ چونکہ عربی زبان کے تحفظ میں مسلمانوں کے مذہب اور کلچر کے تحفظ کا راز پوشیدہ ہے اس لئے اس زبان کی تعلیم و تفہیم کے متعلق ہر کوشش قابل قدر ہے۔ کامل صاحب کی یہ کوشش اسی سلسلہ کی کڑی ہے اور اپنی جگہ پر مفید۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ اگر ایک ایسی کتاب لکھیں جو انگریزی اور اردو گرامر کی ترتیب سے عربی گرامر کو سمجھاتی چلی جائے تو وہ کتاب وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کر دے گی۔ کامل صاحب ایسی کتاب آسانی سے لکھ سکتے ہیں کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ان تمام زبانوں پر عبور حاصل ہے۔

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ

(رازی)

واردھا کی تعلیمی اسکیم پر ہمارا مفصل تبصرہ طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا وہ مضمون ملک کے ہر طبقہ میں مقبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ چنانچہ حال ہی میں اسکا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اور پشتو اور گجراتی میں بھی اُسکے تراجم ہو چکے ہیں اسکے برعکس اس مضمون پر کوئی اعتراض اب تک ہماری نگاہ سے نہیں گزرا۔ یہ اسکیم چونکہ شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی مرتب فرمودہ ہے اسلیئے ہمیں انتظار تھا کہ رسالہ جامعہ میں اسکے متعلق کچھ نہ کچھ شائع ہونا چاہیئے۔ دسمبر ۳۸ء کے جامعہ میں پروفیسر محمد مجیب صاحب کی ایک تقریر چھپی ہے جو انھوں نے جامعہ کے یوم تاسیس کی تقریب پر بہ حیثیت قائمقام شیخ الجامعہ ارشاد فرمائی تھی اس تقریر میں ضمناً ان اعتراضات کیطرف توجہ مبذول فرمائی گئی ہے، جو واردھا اسکیم پر عائد کئے گئے ہیں۔ ہرچند اس تقریر میں طلوعِ اسلام کے مذکورہ صدر مضمون کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ لیکن چونکہ واردھا اسکیم کے مختلف گوشوں پر اسقدر شرح وبسط سے اسی مضمون میں تنقید ہوئی تھی، اسلیئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان جوابات کا تجزیہ کردیا جائے تاکہ جن حضرات نے وہ اعتراضات دیکھے ہیں، وہ ان کے جوابات اور جوابات کی پختگی اور کمزوری سے واقف ہوکر از خود کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ اس مضمون کی بنا رچونکہ قائمقام شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب کی تصریحات ہیں۔ اسلیئے اس میں جامعہ اور جناب شیخ الجامعہ (قائمقام) کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ ورنہ یہ یقین رکھنا چاہیئے۔ کہ اس بحث میں ذاتیات کو کوئی دخل نہیں، ہماری مخالفت اور موافقت پہلے بھی اصولی تھی، اور اب بھی اصولی ہے، ہمارے نزدیک ہر وہ نظریہ۔ مسلک، تجویز یا اسکیم جس سے ملت اسلامیہ کے مفاد پر کوئی زد پڑتی ہو اس قابل ہے کہ پوری قوت سے اسکی مخالفت کیجائے۔ اس باب میں مداہنت یا چشم پوشی، تسامح، یا نرم روی اسلام سے دوستی نہیں دشمنی ہے، ہم اُمید رکھتے ہیں کہ

اربابِ جامعہ بھی ہماری اس تنقید کو انہی معنوں میں لیں گے۔ غلطی کا امکان کس سے نہیں لیکن غلطی کا اعتراف عزم الامور میں سے ہے جسے خدا دے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ

جناب قائمقام شیخ الجامعہ صاحب واردھا اسکیم کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"یہ تجویز بنیادی تعلیم کی ہے، اور خالص تعلیمی ہے لیکن ایک طرف شخص اور مقام کی پرستش کے ایک پرانے میلان نے اسے واردھا اسکیم کا نام دیدیا ہے۔ دوسری طرف جائز بدگمانیوں اور نازیبا خوف نے اسے اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ایک گہری تدبیر ٹھیرا کر اسکی اصل تعلیمی حیثیت کو بالکل مٹا دیا ہے۔" (جامعہ دسمبر ۳۸ء صفحہ ۴۸۵)

یعنی انہیں شکایت ہے کہ ایک خالص تعلیمی اسکیم کو مہاتما گاندھی اور انکے جائے قیام کے لحاظ سے واردھا اسکیم کا نام کیوں دیا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسکیم کو یہ نام دیا کس نے ہے؟ اور نام اور مقام کی اس پرستش کا ذمہ دار کون ہے! یہ رپورٹ اردو میں سب سے پہلے رسالہ جامعہ بابت جنوری ۳۸ء میں شائع ہوئی اور اسکا عنوان رکھا گیا "واردھا تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ" اور "مہاتما جی" کو مخاطب کر کے ان کی خدمت میں اسے پیش کیا گیا۔ اب فرمائیے کہ اس پرستش کا ذمہ دار خود جامعہ ہے یا کوئی اور؟ غالباً یہ چیز قائمقام شیخ الجامعہ صاحب کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ دوسری شکایت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس اسکیم کو اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کے خلاف ایک گہری تدبیر ٹھیرایا گیا ہے۔ یعنی دراصل یہ ایسی ہے نہیں۔ یوں ہی اسے بدنام کر دیا گیا ہے! ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ اسکے متعلق فرماتے ہیں:۔

"ان تمام باتوں نے ایسی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں کہ جنہیں دور کرنے میں ایک عرصہ لگے گا جو شاید اسی وقت دور ہو سکیں جب اس سیاسی کش مکش اور معاشرتی اور اخلاقی مقابلہ کی شدت کچھ کم ہو جو ایک مدت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ جب تک ہندو اور مسلمان کی کش مکش زیادہ تر سیاسی تھی، جامعہ والے یہ کہہ کر اس سے الگ رہ سکتے تھے کہ جامعہ کوئی سیاسی ادارہ نہیں، مسلمانوں کی آزاد تعلیم گاہ ہے اسے سیاسی جھگڑوں سے مطلب نہیں لیکن،

اس فریق سے اُسے ہمدردی ضرور ہوگی جو ہندوستان کو برطانیہ کے قبضے سے چھڑانے کی جدوجہد کرے اور قوم میں آزادی اور خودداری کا چرچا کرے۔ اب مگر یہ کش مکش تہذیبی اور دینی ہوگئی ہے۔ یعنی اسکا میدان وہ خاص سرزمین ہے، کہ جس میں جامعہ نے اپنا گھر بنایا ہے۔ اور کاروبار کرتی ہے اور ہم بُنیادی تعلیم کی تجویز اور اسے آزمانے اور رائج کرنے کی کوششوں کی بدولت اُس ضد اور تعصب کی لپیٹ میں آجاتے ہیں جو مسلمانوں کو ہندوؤں اور کانگرس سے پہلے بھی تھا۔ مگر اب بہت بڑھ رہا ہے۔ ضد اور تعصب کی اس آگ کو بھڑکانے اور پھیلانے کے لیے اتنا ایندھن فراہم ہوتا رہتا ہے کہ وہ ہمارے بجھائے بجھ نہیں سکتی اور اُسکی لپیٹ سے بچنے کے لیے کوئی گوشۂ عافیت تلاش کرلینا جامعہ کے بُنیادی مقاصد سے مُنہ پھیرنا ہوگا۔ لیکن اگر ہم ان غلط فہمیوں کو دُور کرسکے جو اسوقت پھیل رہی ہیں تو اسکا اندیشہ ہے کہ ملّتِ اسلامی سے ہمارا جو تعلق ہے وہ کمزور پڑجائے گا اور جس خدمت کے لیے ہم نے جامعہ کو قایم کر رکھا ہے اسکو ہم انجام نہ دے سکیں گے"۔ (ایضاً ص ۸۹-۸۸)

یعنی اِس اسکیم کے خلاف جسقدر آوازیں ملک کے مختلف گوشوں سے اٹھی ہیں وہ تمام "ضد اور تعصب" پر مبنی ہیں۔ اسکیم بالکل مقدس منزہ عن الخطا ہر قسم کے اتہام سے بالاتر ہے، جب کسی شخص کی یہ حالت ہوجائے کہ وہ اپنے خلاف اعتراض یا تنقید کو "تعصب اور ضد" پر مبنی سمجھ لے تو ظاہر ہے کہ وہ کبھی اپنی اصلاح نہیں کرسکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ وارد ھا اسکیم کے خلاف (مسلم قومیت پرست حضرات کے سوا) قریب قریب ملک کے ہر گوشے سے مُسلمانوں نے اعتراضات کئے ہیں، اربابِ جامعہ کو چاہیے تھا کہ وہ سنجیدگی سے سوچتے کہ ہندوستان بھر کے مسلمان جو اِس اسکیم کی مخالفت کررہے ہیں، تو کوئی نہ کوئی چیز تو اُسکے اندر ایسی ہوگی ہی جو مُسلمانوں کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ اِس تمام مخالفت کو "ضد اور تعصب" پر محمول کرکے مطمئن ہوجانا کہ اسکیم میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں۔ حقایق سے چشم پوشی کرلینا ہے۔ اِس سے آپ اپنے آپ کو تو اطمینان دے سکتے ہیں۔ لیکن قوم کی تسکین

کا سامان بہم نہیں پہونچا سکتے۔ اور جب آپ ابتدا ہی اس خیال سے کریں کہ ان اعتراضات کی بنیاد تعصب اور ضد ہے تو اسکی انتہا معلوم!

اب اعتراضات کیطرف آیئے، فرماتے ہیں :۔

"اسوقت ہمپر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ تین طرح کے ہیں ایک تو یہ کہ ہمارا کانگرس اور گاندہی جی سے جو اشتراکِ عمل ہے وہ وقت کی مصلحت اور مسلمانوں کی عام ذہنیت کو دیکھتے ہوئے ایک اسلامی ادارے کے لیئے مناسب نہیں۔ لیکن تعلیمی اور تعمیری کاموں میں بھی اشتراکِ عمل سے پرہیز کرنا غلط اور خود ہمارے لیئے مہلک ہوگا جب تک مسلمان ہندوستان کی عام زندگی اور کاروبار سے اپنا حصّہ کاٹ کر الگ نہ کرلیں۔ اور اس ربط وضبط کی گنجایش ہی نہ رہے جو پڑوس اور خدمت کا فرض اور سچے اسلامی اخلاق برتنے کا حوصلہ ہمارے لیئے لازمی کردیتا ہے"۔ (ایضاً صـ۴۸۹)

یہ اعتراض ہمارا نہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سا ایسا مسلمان ہے جو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں غیر مسلموں سے اشتراکِ عمل پر معترض ہوسکتا ہے اسلیئے کہ ایسے امور میں تعاون کے لیئے تو قرآنِ کریم کا کھلا، صاف ارشاد موجود ہے، جس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں۔ اعتراض ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ عمل پر نہیں بلکہ اُن کی امامت قبول کرلینے پر ہے۔ موجودہ تحریکِ آزادی میں مسلم قومیت پرست حضرات کس طرح ہر معاملہ میں ہندوؤں کی اطاعت ہی عین شیوۂ حریت پسندی سمجھتے ہیں وہ کسی دیکھنے والی آنکھ سے پوشیدہ نہیں، اس قسم کی اتباع واطاعت کا نام "اشتراکِ عمل" رکھ لینا خود فریبی کی بین مثال ہے۔ اسی تعلیمی اسکیم کے معاملہ کو لیجیئے خود رپورٹ میں اس امر کا اعتراف موجود ہے کہ اسکے بنیادی تصورات مہاتما گاندہی کے دماغ کی آفرینش ہیں۔ ان اصولوں کو عملی شکل میں لانے کے لیئے ایک کمیٹی متعین کی جاتی ہے جسکے صدر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب بنائے جاتے ہیں، رپورٹ مرتب ہوتی ہے تو اس حقیقت کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ :۔

"اور میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی مہاتما گاندہی کی سوجھ بوجھ اور رہنمائی آگے

وقت میں ہمارے کام آئی"؛ (اُردو رپورٹ صلاا)

اور اسے ان الفاظ میں مہاتما جی کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے:۔

ہم یہ رپورٹ آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سچے دل سے اُمید کرتے ہیں کہ آپ کی راہنمائی میں یہ اسکیم ہمارے ملک میں تعلیم کے ایک اچھے نظام کی بنیاد ثابت ہوگی" (ایضاً)

اسکیم میں اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی چیز مہاتما جی کے مزاج کے خلاف نہ ہو۔ چونکہ اہنسا مہاتما جی کا مذہب ہے اسلیئے ہر مقام پر اسکی تصریح کیجاتی ہے کہ تعلیم ایسی ہوگی جس سے بچوں کے دلوں پر اہنسا کی برتری اور فوقیت ثبت ہوجائے چونکہ مہاتما جی یہ سننا تک پسند نہیں کرتے کہ اسلام کو ہندو مت پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ اسلیئے تجویز کیا جاتا ہے کہ بچوں کو یہ سکھایا جائے گا کہ تمام ادیانِ عالم اپنے بنیادی اصولوں میں یکساں ہیں موسیقی چونکہ ہندوؤں کی تہذیب کا ضروری جزو ہے اسلیئے اسے بھی نصاب میں داخل کیا جاتا ہے۔ ہم بادب دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اگر اس کا نام "اشتراکِ عمل" ہے تو پھر اطاعت کی کیا تعریف ہوگی! کیا نبی اکرمؐ سے لے کر اسوقت تک کسی اسلامی نظام تعلیم میں کبھی یہ اجزا بھی شامل ہوئے تھے اور دوسروں کو چھوڑیئے۔ کیا خود جامعہ کے نصاب میں بھی اس سے پیشتر یہ اجزاء موجود تھے؟ جامعہ ایک آزاد درسگاہ ہے۔ اسکے نظام و نصاب کی باگ ڈور خود انہی ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں ہے جو واردھا رپورٹ کے مرتب کرنے والے ہیں۔ اگر ان کے نزدیک صحیح اسلامی تعلیم یہی ہے کہ اہنسا کو ہنسا پر فوقیت ہے، ادیانِ عالم بنیادی سچائیوں کے اعتبار سے یکساں ہیں اور موسیقی ایک عمدہ جوہر ہے تو انھوں نے اپنے ہاں ان چیزوں کو ابتک کیوں رائج نہ کردیا، کیا اس سے پیشتر خود انہیں بھی معلوم نہ تھا کہ صحیح اسلامی تعلیم کیا ہے، اور اب مہاتما جی کے سمجھانے سے معلوم ہوا کہ اسلام کی روح یہی ہے،

باقی رہا "پڑوس اور خدمت کا فرض اور سچے اسلامی اخلاق برتنے کا حوصلہ" تو اس سے بھی کون مسلمان انکار کرسکتا ہے۔ لیکن کیا ہمیں اس چیز کے واضح کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ کہ رواداری صرف اس حد تک رواداری رہتی ہے جب تک وہ کسی اصول زندگی سے متصادم نہ ہو

وہ رواداری جو اپنے اصولوں کو بیچ کر حاصل کی جاتی ہے۔ ملّی خودکشی کہلاتی ہے جسے کوئی باحمیّت قوم گوارا نہیں کر سکتی۔ اسلام جہاں حق ہمسائگی۔ خدمتِ خلق، وسعتِ اخلاق پر زور دیتا ہے وہاں اپنے اصولوں کی خاطر ساری دُنیا کے مقابلہ میں سربکف کھڑے ہو جانے میں بھی رازِ زندگی بتاتا ہے۔ یہاں پہونچکر صحیح اخلاق" وہ رہ جاتا ہے، جسے اوّلین شیخ الجامعہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ :-

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے !
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیئے ہے (مولانا محمد علی مرحوم)

رواداری کی وسعتِ اخلاق کے ساتھ ساتھ خدا کی خاطر دو عالم سے خفا ہو جانے کا حوصلہ بھی نہایت ضروری ہے کہ اسلام ان دونوں سے مرکب ہے۔

دوسرا اعتراض

پھر ارشاد ہے :-

"دوسری قسم کے اعتراضات یہ ہیں کہ وارد ھا اسکیم کے مطابق لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ تعلیم دینا لازمی ہوگا۔ انھیں ناچ گانا سکھایا جائے گا، اسلام کے صحیح اور سچے مکمل اور بہترین مذہب ہونے کا عقیدہ چھوڑ کر ایسی رواداری برتنا سکھایا جائے گا جو ہر طرح کے عقیدوں کو ایک سطح پر لاکر ان کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہنے دیگا یہ تمام اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جنہوں نے بنیادی تعلیم کے نصاب پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے اور جنکا تخیل کچھ ایسا بھڑک گیا ہے کہ اب وہ ہر چیز کو دیکھ کر بدکتا ہے" (ایضاً ص۴۸۹)

لڑکیوں اور لڑکوں کی مخلوط تعلیم کے متعلق ہر چند رپورٹ میں یہ چیز موجود ہے کہ اگر لڑکیوں کے والدین چاہیں تو بارہ برس کی لڑکیوں کو مدرسے سے اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن باایں ہمہ مسلمان اس چیز کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھیں گے کہ بارہ برس کی لڑکیاں بھی عام لڑکوں سے ملیں جُلیں۔ یورپ مخلوط تعلیم کے جو

نتائج بھگت رہا ہے، وہ آج کس سے پوشیدہ ہیں اُن کے پیشِ نظر اس تجربہ کو یہاں دُہرانا کون سی عاقبت اندیشی کا ثبوت دینا ہے، اور پھر جب اس چیز کو سامنے رکھا جائے گا کہ یہ تعلیم جبری ہو گی تو اس اعتراض کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ حکومت کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ والدین کو مجبور کرے کہ وہ اپنی بارہ برس کی لڑکی کو لڑکوں کے ساتھ تعلیم دلائے۔ حکومت اگر لڑکیوں کی تعلیم ضروری سمجھتی ہے تو اُسکے لیے الگ انتظام کرے۔ لیکن اس باب میں پھر وہی جذبہ مرعوبیت کارفرما ہے چونکہ ہندوؤں کے ہاں اس قسم کی مخلوط تعلیم معیوب نہیں سمجھی جاتی اسلیے اُسے رائج کرنے کی تجویز کر دی مسلمان اسے پسند نہیں کرتے۔ تو نہ کریں۔ غلام اور آزاد میں یہی تو فرق ہے۔

موسیقی کے متعلق رپورٹ میں موجود ہے کہ :۔

"اُسکا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو اچھے گیت یاد ہو جائیں۔ اور انھیں اچھے گانے کی پہچان اور شوق ہو جائے۔ بچوں میں تال کا جو قدرتی احساس ہوتا ہے اُسے ترقی دینے کے لیے انھیں دونوں ہاتھوں سے تال دینا سکھایا جائیگا" (اُردو رپورٹ صفحہ ۱۲۳)

قایمقام شیخ الجامعہ صاحب فرماتے ہیں کہ تعلیم موسیقی پر اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جنھوں نے نصاب پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ کیا ہم دریافت کرسکتے ہیں کہ نصاب میں موسیقی کے متعلق وہ کیا چیز ہے جسکے پڑھنے کے بعد تعلیم موسیقی کے متعلق اعتراض پیدا نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں تو صرف ایک جگہ یہ لکھا ملا ہے کہ ارتقائے موسیقی کو ذہن نشین کرانے کے لیے امیر خسرو اور تان سین کے حالات پڑھائے جائینگے۔ (انگریزی رپورٹ صفحہ ۱۵۵) غالباً اس سے یہ کہنا مقصود ہے کہ جس فن کا نشو و ارتقا امیر خسرو جیسے بزرگ مسلمان کی مساعی کا رہین کرم ہے مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو اسکے سیکھنے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جو سوامی سمپورنا نند نے الہ آباد کی موسیقی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ان الفاظ میں پیش کی تھی :۔

"میں نے بعض اردو جرائد میں دیکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ موسیقی مذہب اسلام کیخلاف ہے

اِسلیے مسلمان بچوں کو اِس سے مستثنےٰ رکھنا چاہیئے۔ گورنمنٹ کا یہ منشا نہیں کہ موسیقی کو لازمی[1] قرار دیا جائے۔ لیکن جو لوگ اِس معاملہ میں مذہب کو گھسیٹ لاتے ہیں وہ مذہب کو سمجھتے ہی نہیں یقیناً وہ لوگ یہ کہنے کے لیئے تیار نہ ہونگے کہ موسیقی کے بڑے بڑے مسلمان اُستاد جنکا گزشتہ اور موجودہ زمانہ میں ماہرین فن میں شمار ہوتا ہے اسلام کے خلاف تھے۔" (اسٹیٹس مین مورخہ ۱۱/۸/۳۸)

ہم اِس دلیل کے متعلق اِس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہنا چاہتے کہ کسی اور سے نہیں تو مولانا حسین احمدؒ صاحب ہی سے دریافت فرما لیا جائے کہ شریعت کا اِسکے بارہ میں کیا فیصلہ ہے بالخصوص جبکہ یہ فنِ شریف لڑکیوں کو بھی سکھایا جائے گا۔ اِنکا قول تو قومیت پرست حضرات کے لیئے قابلِ قبول ہوگا!

اب اِن دو بنیادی اعتراضات کیطرف آیئے جنہیں ہم نے اپنے مضمون میں بالوضاحت بیان کیا تھا اور جنکی بنا پر ہمارے نزدیک یہ اسکیم مسلمان بچوں کو اُنکے مذہب سے یکسر بیگانہ بلکہ متنفر بنا دینے کے لیئے کافی ہے، ایک اعتراض کا تو جناب قائمقام شیخ الجامعہ نے ذکر فرمادیا ہے یعنی یہ کہ اس اسکیم کی رُو سے "اسلام کے صحیح اور سچے مکمل اور بہترین مذہب ہونے کا عقیدہ چھوڑ کر ایسی رواداری برتنا سکھایا جائے گا جو ہر طرح کے عقیدوں کو ایک سطح پر لاکر اُن کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہنے دیگا۔" ہمارا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو سکھایا جائے گا کہ اہنسا کے مسلک کو ہمسایہ پر فوقیت حاصل ہے۔

اعتراضِ اوّل کو پہلے لیجیئے:۔

قائمقام شیخ الجامعہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں "جنہوں نے بنیادی تعلیم کے نصاب پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی، اور جنکا تخیل کچھ ایسا بھٹک گیا ہے، کہ اب وہ ہر چیز کو دیکھ کر بدکتا ہے۔"

---

[1] وارد ہا اسکیم کی روسے یہ مضمون دیگر مضامین کی طرح جبری پڑھایا جائیگا۔ منہ

ہم نے اپنے مضمون میں شرح و لبسط سے بتایا تھا کہ صحیح مذہبِ اسلام کیا ہے۔ اور اس اسکیم کی رُو سے جس قسم کا اسلام بچوں کے سامنے پیش کیا جائیگا وہ اصلی اسلام سے کس قدر مختلف ہوگا، جناب قائمقام شیخ الجامعہ صاحب کے نزدیک اس مسئلہ کو اتنی اہمیت بھی حاصل نہیں کہ بنیادی تعلیم کے نصاب کو سامنے رکھ کر اس اعتراض کا جواب ارشاد فرما دیا جائے بلکہ وہ نہایت شانِ استغنا سے صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ یہ اعتراض ان لوگوں کی طرف سے کیا گیا ہے جنہوں نے نصاب کو نہیں دیکھا اور محض تخیل ہر چیز سے بدتر ہے۔ نصاب جو انگریزی کی رپورٹ (Basic National Education.) کی شکل میں شائع کیا گیا ہے ہمارے سامنے ہے، مذہب کے متعلق ایک چیز تو ہمیں یہ نظر آئی کہ مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کی بڑی بڑی شخصیتوں کے سوانح حیات پڑھائے جائیں گے۔ مثلاً مہاتما بُدھ، حضرت عیسیٰؑ، نبی اکرمؐ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ، جناب زرتشت، سقراط، امام حسینؓ، نکلسن، پاسچر، سن یٹ سن، مہاتما گاندھی، مارکس ایربلیس۔ مہاراجہ اشوک، محمد بن قاسم، خواجہ معین الدین چشتیؒ۔ حضرت عمرؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، سلطان صلاح الدین، حضرت بلالؓ، ہارون الرشید، شیر شاہ، ٹوڈرمل۔ امیر خسرو۔ بابا فرید وغیرہ

اِس سے ہم تو یہ نہیں سمجھ سکے کہ ان تاریخی کہانیوں سے یہ کس طرح ثابت کیا جائے گا کہ مذہبِ اسلام دیگر مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے، اسلیئے اس حصۂ نصاب سے تو ہمارے اعتراض کا جواب مل نہیں سکتا۔ البتہ ایک ٹکڑا ایسا ہے جس سے ہمارا اعتراض اور قوی ہو جاتا ہے "مسلمانوں کی تہذیب" کے عنوانوں کے نیچے درج ہے کہ بچوں کو امیر خسرو، کبیر، گرو نانک، اکبر اور دارا شکوہ کی کہانیوں سے بتایا جائیگا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوئے (انگریزی رپورٹ صفحہ ۱۵)

حضرت امیر خسرو کے متعلق تو ہمیں علم نہیں کہ اُن کی وجہ سے مذہب اسلام یا ہندو مت میں کیا تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ بھگت کبیر اور گورو نانک، ان الگ فرقوں کے بانی ہیں جو آج مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ اسلیئے اسلام کے متعلق ان کی کہانیوں سے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکے گا، البتہ اکبر اور دارا شکوہ کے دو نام ایسے ہیں، جنکے متعلق عام طور پر معلوم ہے کہ وہ اسلام میں کس قسم کی تبدیلیوں

کے موجب بنے تھے، یہ حکایت ذرا تفصیل طلب ہے۔

اسکیم میں مذہبی تعلیم کے متعلق اُصولی طور پر درج ہے کہ

"دُنیا کے مذہبوں کے اصُول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں" (اُردو رپورٹ صہ ۱۱۹)

انگریزی رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں جو زیادہ واضح ہیں:۔

"Showing how in essentials they (different religions) meet in perfect harmony" (P 22)

جس کا ترجمہ یہ ہوگا:۔

"یہ ثابت کیا جائے کہ ایسی اصولی باتوں میں جو لائینفک ہوں (Essentials کا یہی مفہوم ہے) کس طرح تمام مذاہب میں مکمل یکسانیت (یا ہم آہنگی) ہے"۔

یہ ہے اصول اور اسی اُصول کو ثابت کرنے کے لیئے اکبر اور دارا شکوہ کی تاریخ پڑھائی جائیگی، یہ سب کو معلوم ہے کہ اکبر نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی تھی اِس مذہب کے عناصر ترکیبی کیا تھے۔ اسکی تفصیل تو طویل ہے البتہ اسکی بنیاد کن اصُولوں پر تھی۔ انکا بیان کرنا دشوار نہیں۔ عہد اکبر کے مشہور مؤرخ مُلّا عبدالقادر بدایونی اپنی کتاب منتخب التواریخ میں اِس دین اور اُسکے اساسی اُصولوں کی تفصیل دی ہے جسکے دَوران میں وہ رقمطراز ہیں:۔

"دریں سال اسافل و اراذل عالم نمائے جاہل تعاضد دلائل باطل نمودہ بریں آورندکہ حالا صاحبِ زمانے کہ رافع خلاف و اختلاف ہفتاد و دو ملّت از مُسلم و ہنود باشد حضرت اند"۔ (صہ ۲۷۹)

(اِس سال چند رذیل ادنیٰ درجہ کے لوگ جو عالم نما جاہل ہیں اُنہوں نے دلیلوں کا پشتہ اس دعوے کے متعلق باندھ دیا کہ وہ صاحبِ زمان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے بہتر فرقوں کے اختلاف مٹانے والا ہوگا۔ حضرتِ بادشاہ کی ذات ہے)

یعنی اِس نئے دین کا محرک جذبہ یہ تھا کہ اُسکے ذریعہ ہندوں اور مسلمانوں کا مذہبی اختلاف مٹا دیا جائے گا۔ اب اسکے لیئے دلیل مُلاحظہ ہو۔

عُقلا در ہمہ ادیان موجود و مہیا اند و ارباب ریاضیات وکشف و کرامات در کل طوائف انام پیدا، و حق ہمہ جا دائر۔ پس انحصار آں در یک دین و یک ملّت کہ نو پیدا شدہ و ہزار سال بر و نگزشتہ باشد، چہ لازم و اثبات یکے و نفی دیگر ترجیح بلا مُرجح از کجا؟ (ص ۲۵۶)

(تمام مذاہب میں عقلمند موجود ہیں اور پائے جاتے ہیں۔ اِس طرح کشف و کرامت والے بھی دُنیا کے تمام لوگوں میں پائے جاتے ہیں اور حق بھی تمام مذاہب میں موجود ہے پھر اسکو صرف ایک مذہب اور ملت میں محدود کر دینا کس طرح جائز ہوگا اور وہ مذہب بھی ایسا جو بالکل نو وارد ہے، جسے ابھی ہزار برس کا عرصہ بھی نہیں گزرا، یقیناً ایک مذہب کو صحیح خیال کرنا اور دوسرے کو غلط ٹھہرانا بلا وجہ کی ترجیح ہے۔)

یہ تو تھا اکبر کا مذہب، اب دورِ حاضرہ میں اسکی صدائے بازگشت مُلاحظہ فرمایئے، واردھا اسکیم کے سلسلہ میں مہاتما گاندھی فرماتے ہیں :۔

"مختلف طبقات و مذاہب کے بچوں میں رواداری اور دوستی کی جو رُوح پیدا ہو رہی ہے میں اسکے پیشِ نظر اِس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ انکو یہ سکھایا جائے کہ انکا مذہب دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں اُنکے نزدیک بس وہی مذہب سچا ہے اگر یہ تفرقہ انگیز روح قوم میں سرایت کر گئی تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر فرقہ کا علیحدہ اسکول ہو جس میں ہر ایک کو مذمت کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔ یا پھر ایسی درسگاہوں میں مذہب کے تذکرہ کو بالکل ہی ممنوع قرار دیا جائے۔" (ہندوستان ٹائمز ۱۷ ؍ جولائی)

دیکھیئے! جذبہ محرکہ بھی وہی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تفرقہ مٹا دیا جائے۔ اور بنیادی اُصول بھی وہی کہ نہ تو اسلام دیگر ادیان پر برتری رکھتا ہے نہ یہ درست ہے کہ باقی ادیان باطل ہیں دوسری

جگہ مہاتما جی فرماتے ہیں کہ "تمام مذاہب اہم اصولی باتوں میں ایک جیسے ہیں" (نیشنل کال ۸ ۶/۳۸)
اب مہاتما جی کے ان خیالات کو سامنے رکھیے اور پھر ایک نظر ڈالیے وار دہا اسکیم کے اس ٹکڑے پر کہ "یہ ثابت کیا جائے کہ اصولی باتوں میں تمام مذاہب میں یکسانیت ہے"۔ صاف معلوم ہو جائیگا کہ "یہ الہام" کون سے آسمان سے نازل ہوا ہے اور اکبر کو نصاب کے اندر کیوں شامل کیا گیا ہے اکبر اور اسکی ان خدماتِ جلیلہ کے متعلق ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر کانگرسی حکومت بہار کے ارشادات ملاحظہ ہوں، فرماتے ہیں :۔

"بعض نے اپنے ولولہ اور جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیش نظر ایک ایسے جدید مذہبی نظام کی نشو و نما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جاسکتیں"۔ (جامعہ اکتوبر ۳۷ء)

لیکن اکبر کی اُن "غیر معمولی خدمات" کے متعلق اسلام کا کیا حکم ہے، اسکے متعلق اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ حضرت امامِ ربانی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ اُس زمانہ میں اُٹھے اس دینِ جدید کے مٹانے میں انہوں نے مسلسل جدّ وجہد کی اور یہ اُنکا وہ معرکۃ الآرا کارنامہ ہے جسے تمام مسلمان آج تک متفقہ طور پر "جہادِ عظیم" تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں۔ دینِ اکبر کا فتنہ کس قدر مہلک اور اسکو مٹانے کے لیے کس قدر کوششیں ہوئیں وہ کیسی عظیم المرتبت تھیں۔ اُسکے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب تذکرہ دیکھیے جو دورِ قومیت پرستی سے پہلے لکھی گئی تھی۔ اکبر کے دین جدید کو مولانا آزاد الحاد و بدعت کا فتنہ قرار دیتے ہیں (تذکرہ صد ۱۹ وصد ۲۴۲) اور حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ :۔

"کچھ شک نہیں کہ توفیقِ الٰہی نے حضرت ممدوح کے وجودِ گرامی ہی کے لیے یہ مرتبہ خاص کر دیا تھا، انبیاء اولوالعزم کی نیابت و قائمقامی یعنی مقام عزیمتِ دعوت کا خلعت صرف اُنہی کے جسم پر چست آیا"۔ (تذکرہ صد ۲۴۳)

لیکن وہ دور ختم ہو گیا۔ اور اکبر کی وہی کوششیں جنکے خلاف اُٹھنا جہاد تھا، اب قومیت پرست حضرات کے نزدیک مستحق ہزار تبریک قرار پاگئیں۔ اور صحیح اسلام وہی دین الٰہی سمجھا جانے لگا جو اُسنے ایجاد

کیا تھا۔ اور وہی مولانا آزاد جو اس دین کے مٹانے والوں کو مجاہدین قرار دیتے تھے۔ خود اسی دین کی تجدید کرنے لگ گئے، ایک محبّ دُرِاکبر کے دور کے تھے، جنکا جہادِ تجدد دینِ اکبر کو مٹانا تھا، اور ایک "مجدد" اس دور کے ہیں جنکا کارنامہ مٹے ہوئے دینِ اکبر کی تجدید کرنا ہے، دینِ اکبر کی بنیاد جیسا آپ دیکھ چکے ہیں یعنی اسکا مدار اس عقیدہ پر ہے کہ حق تمام مذاہب میں موجود ہے اسے صرف ایک مذہب میں مقید کر دینا کسی صورت میں صحیح نہیں، اور مولانا آزاد فرماتے ہیں:۔

"اُسنے (قرآنِ کریم نے) نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف لکھ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں اُسنے کہا کہ دین خدا کی بخشش ہے اسلیئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت ہی کو دیا گیا ہو۔ اور دوسروں کا اسمیں کوئی حصہ نہ ہو"

(ترجمان القرآن جلد اوّل ص۱۶۲)

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

"یہ اصلِ دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں ہے کہ اسکے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو، یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے"۔ (ایضاً ص۱۳۷)

فرمایئے! اس دین میں اور اکبر کے دین میں کچھ فرق ہے؟

اب ان تمام کڑیوں کو ملایئے تو بات واضح ہو جائیگی۔ مہاتما گاندھی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کسی طرح مسلمان بچوں کے دل سے یہ بات نکال دی جائے کہ حق صرف انہی کے مذہب میں ہے اور اسلیئے اُنکے مذہب کو دیگر مذاہب پر برتری حاصل ہے۔ اب اس خیال کو عملی شکل میں لانے کے لیئے قومیت پرست مسلم حضرات اپنی اپنی خدمات پیش کرتے ہیں، اکبر کے دین کو جو بالکل اسی خیال پر مبنی تھا اجاگر کیا جاتا ہے۔ اسکی خدمات جلیلہ کو سراہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر سے اس خیال کی سچائی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تعلیمی اسکیم میں اسکو شامل کر دیا جاتا ہے اسکے نصاب میں اکبر کو داخل کیا جاتا ہے اور اسپر اعتراض کرنے والوں کو ضدّی اور متعصب قرار دیا

جاتا ہے اُنکے تخیل کو بھڑکنے اور بدکنے والا بتایا جاتا ہے اور ان اعتراضات کا کوئی جواب دینے کی بجائے، اتنا کہہ دینا کافی سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے نصاب ہی کو نہیں دیکھا اور اسپر دعوے کیا جاتا ہے کہ ہم آزادی کے مدعی ہیں، حریت پسند ہیں۔

باندھتے ہیں سرو کو آزاد اور وہ پا بگل

کیا وہ آزادی جہاں یہ حال ہو آزاد کا

نصاب میں اکبر کے ساتھ دوسرا نام داراشکوہ کا ہے ہم حیران ہیں کہ داراشکوہ کے متعلق کیا لکھیں اسلیے کہ جس شخص نے اسکی شطحیات کو ایک نظر بھی دیکھا ہے اُسے بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ داراشکوہ کو اسلام سے کتنا تعلق تھا؟ اسکی نسبت ہم سید سلیمان ندوی کا یہ جملہ نقل کردینا کافی سمجھتے ہیں کہ

"گو اورنگ زیب کی پالیسی کی وجہ سے سلطنت مغلیہ کو زوال ہوا ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطنت گئی مگر اسلام باقی رہ گیا۔ اگر داراشکوہ تخت نشین ہوتا تو خواہ سلطنت باقی رہتی، مگر ہندوستان سے اسلام ختم ہو جاتا۔" (بحوالہ الفرقان بریلی)

یہ ہیں وہ "مشاہیر اسلام" اور "مجددین کرام" جنہیں آزاد دَورِ حکومت کی تعلیمی اسکیم کے نصاب میں نمایاں جگہ دی گئی ہے۔

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں ۔۔۔ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات

اب اس اعتراض کے دوسرے حصہ کو لیجیے۔ مہاتما گاندھی انگریزی رپورٹ کے مقدمہ میں قومی تعلیم کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ قومی سے مفہوم سچائی اور اہمسا ہے اہمسا اُنکا مذہب ہے فرماتے ہیں:۔

"میں دوسری چیزوں کی طرح سیاسیات کو بھی مذہبی اسپرٹ میں غور کر رہا ہوں میرا مذہب وہی ہے۔ جس کی تکمیل کا واحد ذریعہ اہنسا ہے میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تلوار کے اصول کو مسترد کردیا ہے۔" (حق لکھنو مورخہ ۲۷ جولائی)

اب وارد ہا اسکیم کو دیکھیے۔ بنیادی اصولوں کے ماتحت انگریزی رپورٹ کے صفحہ ۱۲ پر لکھا ہے کہ:۔

ہمارے بچوں کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اہمسا کو ہمسا پر فوقیت حاصل ہے۔"

سماج کے علم" کے عنوان میں بطور اصول درج ہے کہ :-

جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے، اور امن کے ذریعہ صلح حاصل کی ہے اُن کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہئیں، انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہئیں، جنسے اہمسا اور اسکے ساتھ کی خوبیوں کا ہمساد ہو کے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو۔" (اُردو رپورٹ ص۱۱۹)

انگریزی کے الفاظ ہیں :-

(Superiority of non-violence in all its phases .....over violence.) (انگریزی رپورٹ ص۲۳)

ہم نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ اسلام کی رُو سے غلط ہے کہ اہمسا کو ہمسا پر فضیلت حاصل ہے اسلام میں اپنے وقت پر اہمسا بھی جوہر ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی اپنے موقعہ کے لحاظ سے ہمسا بھی ویسا ہی، بلکہ اس سے زیادہ ضروری جوہر ہے ایسی تعلیم جس میں اہمسا کی فوقیت ثابت کی جائے ہندو مت کا فلسفہ اور مہاتما گاندھی کا مذہب ہے اور اگر یہ تصور بچوں کے ذہن میں جاگزین ہو جائے تو اسلام ان کے نزدیک وحشت اور بربریت کا مذہب رہ جائیگا اور صرف وہی لوگ قابل عزت ہونگے جنہوں نے اپنی زندگی اہمسا کے اُصولوں پر کاربند رہتے ہوئے بسر کی ہوئی ہو۔ جناب قایمقام شیخ الجامعہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ اعتراض ان لوگوں کی طرف سے کیا گیا ہے، جنہوں نے نصاب کو نہیں دیکھا اس مقام پر ہم پھر حیران ہیں کہ نصاب دکھانے کے بعد وہ کس طرح اس اعتراض کو رفع کر دینگے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، نصاب کے تیسرے درجہ میں لکھا ہے کہ بچوں کو مہاتما بدھ حضرت عیسیٰؑ اور نبی اکرمؐ کی کہانیاں پڑھائی جائیں۔ اب آپ پہلے اس بات کو سامنے رکھیے کہ بچوں کو اُصولاً یہ بتایا جائے گا کہ اہمسا کو ہمسا پر فوقیت حاصل ہے، اسکے بعد مہاتما بدھ اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے حالات بتائے جائیں گے جن کی تمامتر تعلیم اہمسا پر مبنی ہے اور اسکے بعد نبی اکرمؐ کی سیرت مقدسہ سامنے آئے گی جس میں ہمسا کا پہلو یقیناً اہمسا سے زیادہ نمایاں ہے، زیادہ نہیں تو برابر ہی سمجھ لیجئے۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ

ان تین ہستیوں میں سے کس کی عزت بچے کے دل میں قایم ہوگی! ہم حیران ہیں کہ ارباب جامعہ باوجود ماہرین تعلیم ہونے کے اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ تاریخ سے بچہ ہمیشہ اپنے عقیدہ کے مطابق اثر قبول کیا کرتا ہے، جب آپ عقیدہ یہ پیدا کریں گے کہ اہنسا کو ہمسا پر فضیلت حاصل ہے تو کیا اسکا فطری نتیجہ (Natural Corollary) یہ نہیں ہوگا کہ مہاتما بدھ کو محمد رسول اللہ پر فضیلت حاصل ہے پھر اسکے بعد نصاب میں جناب زرتشت۔ سقراط۔ امام حسین، یاسپجر، سن یٹ سن۔ مہاتما گاندھی وغیرہ کی کہانیوں کا حصہ آتا ہے (انگریزی رپورٹ صلا۱۳) پھر حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیز، محمد بن قاسم، حضرت بلالؓ۔ ہارون الرشید، سلطان صلاح الدین وغیرہ کی کہانیاں مندرج ہیں۔ (صفحہ ۱۵۹ تا ۱۷۱) ہم تو یہی سمجھ سکے ہیں کہ یہ کہانیاں تقابل کا کام دیں گی یعنی جیسا کہ اصول تعلیم میں درج ہے اہنسا کی خوبیوں کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب ہنسا کی برائیاں بھی سامنے ہوں۔ اسلیے حضرت عمرؓ اور سلطان صلاح الدین جیسے حضرات کی کہانیاں بھی بیان کرنی ضروری ہوں گی، ہم نہیں کہتے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اِن چیزوں کو اس نیت سے شامل نصاب کیا ہے لیکن بہرحال انکا نتیجہ تو یہی ہوگا اور اسی کے خلاف ہم نے اعتراض کیا تھا۔ ہم اربابِ جامعہ کی خدمت میں با دب گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ اصل خرابی اِس اصول کے اندر ہے کہ بچوں کو یہ سکھایا جائے گا کہ اہنسا کو ہمسا پر فوقیت حاصل ہے، جب تک یہ اصول قایم ہے فروعات میں اکابر اسلام کی سوانح حیات شامل کرنا اُلٹا اثر پیدا کرنے کا موجب ہوگا، یہ عقیدہ ہی کا تو اختلاف ہے کہ جس سے ایک عیسائی نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ سے بالعموم وہ اثرات اخذ کرتا ہے جنکے تصور سے ایک مسلمان کی روح کانپنے لگ جاتی ہے، جب تک آپ اِس اسکیم سے اس اصل کو نہ بدلیں گے، فروعات میں تبدیلیاں پیدا کرنے سے کچھ نتیجہ حاصل نہیں ہوگا۔ اور اس اصول کو بدلنے کی تحریک کیجیے پھر دیکھیے کہ یہ بڑے بڑے وسیع الظرف ہندو جن میں خود مہاتما گاندھی بھی شامل ہیں۔ آپ کی اِس تحریک کا کس انداز میں "سواگت" کرتے ہیں پھر اس چیز کا ذکر کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ نصاب میں یہ بھی درج ہے کہ تحریک ستیہ گرہ کو بہ حیثیت ایک عالمگیر قوت کے پیش کیا جائے گا۔ یعنی پہلے جس چیز کو بطور نظریہ کے پیش کیا جائے گا۔ اخیر میں اسکی

عالمگیر کامیابی کا ثبوت بھی دیا جائے گا۔

تیسرا اعتراض

فرماتے ہیں :۔

"تیسرا اعتراض جو ہم پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے جامعہ میں تو دین کو تعلیم کا سنگ بنیاد بنایا ہے اور عام جبری تعلیم کی تجویز میں مذہب کو بالکل ہی نظر انداز کیا ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جس کی طرف میں آپ کی خاص طور سے توجہ دلانا چاہتا ہوں۔" (جامعہ دسمبر ۳۸ء ص ۴۸۹)

یہ اعتراض ہمارا نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ اس تعلیم میں نماز۔ روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے فقہی مسائل کیوں نہیں رکھے گئے، ہمیں ان مسائل کی اہمیت سے انکار نہیں، ہم ان چیزوں کو مسلمان بچوں کی تعلیم کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں، ہمارا اعتراض تو یہ ہے کہ اس اسکیم کی بنیاد ہی مذہب کی تعلیم کے اوپر ہے اور وہ ایسی تعلیم ہے جو اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف ہے اگر اس اسکیم میں مذہبی تعلیم نہ ہوتی تو مسلمانوں کے بچے اسلام سے بیگانہ رہتے، لیکن جس قسم کی مذہبی تعلیم اسکے اندر موجود ہے اس سے تو بچے اسلام سے متنفر ہو جائیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ مذہبی تعلیم میں ایک چیز تو ہے جزئیات۔ جسے فقہی مسائل یا شاستروں کے ارتھ کہا جاتا ہے، دوسری چیز ہے، مذہب کا اصول یا روح۔ یہ چیز اساسی اور بنیادی ہے اس اسکیم میں مذہب کے متعلق اساسی اور بنیادی تعلیم موجود ہے، اور وہ تعلیم بدھ مت اور برہمو سماج کے مذہب کی ہے۔ جسکا مجموعہ آج مہاتما گاندھی کا مذہب ہے اور جسے وہ آئندہ ہندوستان کا مذہب قرار دینا چاہتے ہیں۔ اور جیسا کہ بار بار واضح کیا جا چکا ہے، اسکے دو ٹکڑے ہیں اوّل۔ تمام مذاہب ایک جیسے ہیں اور دوسرے اہمسا بہترین فلسفۂ حیات ہے، چونکہ یہ ایسا اعتراض ہے جسکا کوئی جواب بن نہیں پڑتا اسلئے جناب قائمقام شیخ الجامعہ صاحب اس اعتراض کو تو گول کر گئے اور دوسرے اعتراض کو نمایاں کر کے سامنے کر دیا۔ اور اسکا جواب دینے کی بھی کوشش کی گئی۔ اس لیے کہ اس بات کو

مان لینے میں عافیت ہے کہ اِس اسکیم میں مذہب کی تعلیم نہیں ہے، بہ نسبت اسکے کہ اس میں ایسی تعلیم ہے جو مذہب اسلام کے خلاف ہے۔ اور جسے مہاتما گاندھی ملک میں پھیلانا چاہتے ہیں یہ دعویٰ کہ وارد ھا اسکیم کے ذریعہ مہاتما گاندھی اپنے مذہب کی تعلیم پھیلانا چاہتے ہیں، ہمارا ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے مشہور ہندو لیڈر بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اگلے دنوں سرراد ھاکرشن نے وارد ہا اسکیم کے موضوع پر وارد ھا میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"نوعِ انسانی کی نجات اِس چیز میں ہے کہ مذہب ہماری تعلیم، سیاسیات اور معاشیات میں شامل رہے۔ مسٹر گاندھی اِس چیز کو اپنی جدید وارد ہا کی تعلیمی اسکیم ہریجن کی اصلاح اور چرخہ اور گھریلو دستکاری کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

(اسٹیٹس مین مورخہ $\frac{12}{38}$ ۲۸)

کیوں؟ اب بھی کہا جائیگا کہ وارد ھا اسکیم میں مذہب کو تعلیم سے الگ رکھا گیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس اسکیم میں اسلام کی تعلیم کو الگ رکھا گیا ہے اور ہندومت کی تعلیم کو شامل کیا گیا ہے۔

اِس اعتراض کا جواب کہ اِس اسکیم سے مذہبی تعلیم کو خارج کیوں کر دیا گیا ہے (جو صحیح نہیں ہے) یہ دیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کو کبھی حکومت کے ہاتھ میں دینا ہی نہیں چاہیئے، اسکا خود انتظام کرنا چاہیئے اور دوسرے یہ کہ یہ تعلیم پانچ سے سات سال تک کی عمر میں علیحدہ دی جا سکتی ہے۔ پہلی چیز کے متعلق تو ہم اتنا عرض کرینگے کہ ہم آزادی اور غلامی میں اس باب میں یہی فرق سمجھتے ہیں کہ غلامی میں حکومت اپنی منشاء کے مطابق تعلیم کا انتظام کرتی ہے، اور آزادی میں یہ انتظام لوگوں کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی مسلمانوں کی یہی حالت رہی کہ جسقدر تعلیم کا انتظام حکومت کی طرف سے ہو وہ اُن کی مرضی اور مذہب کے خلاف ہو اور جس قسم کی تعلیم یہ چاہیں اُسکے متعلق کہہ دیا جائے کہ اسکا خود انتظام کرو۔ تو اُس آزادی اور اِس غلامی میں فرق کیا ہوگا۔ اتنا فرق ضرور ہوگا کہ آج کی غلامی میں حکومت کا وضع کردہ نظام جبری نہیں ہے جسکا جی چاہے بچے کو یہ تعلیم دلائے

جسکا جی چاہے اپنا انتظام کرلے لیکن آنیوالی "آزادی" میں یہ اختیار جبر سے بدل جائے گا۔ اور ہر ایک لڑکے لڑکی کو وہ تعلیم دلانی پڑے گی، جو حکومت کیطرف سے تجویز ہوگی اور جسکا خاکہ وار دھا اسکیم میں موجود ہے۔

باقی رہا یہ کہ مذہبی تعلیم کا انتظام پانچ سے سات برس کی عمر تک "دو برس میں" ذاتی طور پر کرلیا جائے تو ہمیں ایک تعلیم کیطرف سے اس قسم کی تجویز سنکر ہنسی بھی آتی ہے اور افسوس بھی، پانچ سے سات سال تک کی وہ عمر جب وار دھا اسکیم کی رُو سے بھی تعلیم کے لیے موزوں نہیں سمجھا گیا اس عمر کو اور دو برس کی مدّت کو مذہبی تعلیم کے لیئے کافی قرار دیا جاتا ہے۔ آج کل جامعہ میں پانچ برس کے بچے داخل کر لیئے جاتے ہیں کیا اربابِ جامعہ اسکی تصریح فرمائینگے کہ وہ ان بچوں کو دو برس میں کس قدر مذہبی تعلیم دیدیتے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ اِن دو برس میں بچہ تختی لکھنا سیکھے گا، یا وہ مذہبی علوم کی اِس حد تک تحصیل کرے گا جو تمام عمر اسکے کام آئے، یا آئندہ سات برس میں اسے جو خلافِ مذہب تعلیم ملنے والی ہے کم از کم اُسکے اثرات سے بچنے کے لیئے اپنے آپکو مسلح کرے۔ اور پھر یہ بھی واضح رہے کہ اس مذہبی تعلیم کے لیئے "حکومت سے کسی قسم کی رعایت یا سہولت کی درخواست کرنا بھی دُرست نہ ہوگا (جامعہ صنہ ۴۹)

مذہبی حیثیت:۔ ہم اس چیز کو ایک مرتبہ پھر دُہرا دیں کہ وار دہا اسکیم کے متعلق ہمارے اعتراضات فنّی یا اصطلاحی نہیں بلکہ وہ خالص مذہبی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ وہ اہم مسئلہ ہے جسے کوئی صاحب بصیرت مسلمان نظرانداز نہیں کرسکتا۔ ہم اربابِ جامعہ اور اسکیم کے مسلمان مرتب کنندگان کی خدمت میں گزارش کرینگے کہ وہ اِس مسئلہ کی اہمیت کو سامنے رکھیں اور ان اعتراضات کو تعصب، ضد اور نصاب سے لاعلمی پر محمول کرکے اپنے آپ کو غلط اطمینان دینے کی کوشش نہ کریں، بلکہ انپر سنجیدگی سے غور کریں اور اس مسئلہ کو مذہبی حیثیت سے سوچیں اور اربابِ نظر سے اسکے متعلق استصواب

صلہ ہم نے اربابِ جامعہ اسلیئے لکھا ہے کہ جناب قائمقام شیخ الجامعہ صاحب نے فرمایا ہے کہ "میں نے اسوقت جو کچھ عرض کیا ہے وہ کچھ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اِس یقین کے ساتھ کہ یہ کم و بیش جامعہ کے کارکنوں کے عام خیالات ہیں (جامعہ صلہ ۴۹) صنہ ۱۲

کریں، امارتِ شرعیہ بہار کی رپورٹ طلوع اسلام کے ایک سابقہ پرچہ میں شائع ہو چکی ہے حال ہی میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے باوجود اس کبرسنی اور علالت کے مسلم لیگ کے نام جو پیغام بھیجا ہے اسکے دوران میں وہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

اسکے بعد میں ایک خطرہ کیطرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے اگر اسوقت غفلت برتی گئی تو اسکا انجام اسلام اور مسلمانوں کے لیئے نہایت خطرناک ہوگا۔ یہ خطرہ وارد ہ کی تعلیمی اسکیم ہے یہ اسکیم اپنی ظاہری صورت میں جسقدر معصوم معلوم ہوتی ہے اسی قدر مسموم اور زہر آلود ہے۔ اسکی تہ میں بے انتہا خطرات ہیں جو مسلمان بچوں کے خرمن اسلام کو پھونک کر یک دم خس وخاشاک کر دینگے۔ اور قومیت متحدہ کے علمبرداروں کا بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی روح باقی نہ رہے، سب سے بڑا خطرہ جسپر اسکی بنیاد قایم کی گئی ہے یہ ہے کہ سچائی تمام مذاہب میں موجود ہے اور اصولی اعتبار سے ہر مذہب سچا ہے۔ کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں آپ خود غور فرمالیں کہ اس تعلیم کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مطلب صاف ہے کہ سچائی ہر مذہب میں موجود ہے اور یہ ہی ذریعۂ نجات ہے اور نجات ہی کے واسطے مذہب کو اختیار کیا جاتا ہے تو اسکے لیئے کسی خاص مذہب کیضرورت نہیں، مسلمان رہو یا ہندو بنجاؤ یا عیسائی ہو جاؤ نجات ہر حال میں ہو جائے گی۔ اگر یہ اسکیم ہندوستان میں رائج ہو گئی تو مسلمانوں کا مذہب تو باقی رہ ہی نہیں سکتا جسکی بنیاد اسپر ہے۔ ہو الذی ارسل رسولہ بالہدی و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ وکفی باللہ شہیدا۔ وما ذا بعد الحق الا الضلال فانی تصرفون مقام شکر ہے کہ لیگ نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا ہے اور وارد ہا اسکیم کی مخالفت شروع کر دی ہے مگر جس درجہ کا یہ خطرہ ہے اس قوت کے ساتھ ہنوز مخالفت نہیں کی گئی، میں نے ابتدا ہی میں اسکے متعلق ایک فتوئے شرعی حیثیت سے لکھا تھا جو الامان میں دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے اور اس کی تفصیل اس مضمون میں ہے

جو رسالہ طلوع اسلام دہلی میں وارد ہا ایکم کے متعلق شائع ہو کر کتابی شکل اختیار کر چکا ہے خدا کے لیے اس بلا کو مسلمانوں کے سر سے ٹالیے ورنہ اندیشہ ہے کہ آئندہ نسلیں اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ اور روٹی اور پیٹ کے لالچ میں سب کچھ مسلمانوں سے چھین لیا جائیگا۔ مدبرانِ لیگ کا فرض ہے کہ اس خطرہ کا پوری قوت سے مقابلہ کریں"

اگر اربابِ جامعہ ہندوستان کے ان حضرات کے متعلق یہ خیال کرتے ہوں کہ انکے خیالات جنبہ داری پر محمول ہیں تو ہمسا اور دین کے متعلق ہر دو مذکورہ صدر اعتراضات کو بیرونِ ہند کے اسلامی علماء کے پاس بھیجکر دریافت فرمالیں کہ ان کی کیا رائے ہے اور اگر اہلِ جامعہ مسلمانوں کے ان احساسات کو کچھ اہمیت ہی نہیں دیتے تو پھر خدا حافظ! جہاں مسلمانوں کی ہزاروں امیدیں اور ٹوٹی ہیں ان میں ایک یہ بھی سہی۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

عید

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں

عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

(اقبال)

حقایق و عبر

(۱) انگریز کو نکال دو

ہمارے مسلم قومیت پرست حضرات اپنے مسلک کے جواز میں کہا کرتے ہیں کہ اسوقت سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ ملک سے انگریز کو نکال دو۔ جب یہ ہو جائے تو پھر ہندو اور مسلمان باہمی حقوق کا تصفیہ کر کے یہاں ایک جمہوری حکومت قایم کرلیں، یہ دلیل کہیں انتہائی فریب خوردگی پر دلالت کرتی ہے۔ کہیں فریب کاری پر۔ دنیا میں نظامِ حکومت کی جگہ دوسرا نظام قایم کرنے کے دو طریقے ہوا کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پہلا نظامِ حکومت یک لخت اُلٹ دیا جائے۔ تمام عمارت بلا تامل مسمار کردی جائے اسکی بنیادوں تک کو اُکھیڑ دیا جائے۔ اور اس طرح جب تخریب کی تکمیل ہو جائے تو پھر اس مسمار شدہ عمارت کی جگہ ایک جدید عمارت کی تعمیر شروع کیجائے۔ انقلاب درحقیقت اسی قسم کی تبدیلی کا نام ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ درست ہے کہ جب تخریبی پروگرام زیرِ عمل ہو تو بعد میں آنیوالے تعمیری پروگرام کی نسبت جھگڑا قبل از وقت ہوتا ہے۔ لیکن انقلاب کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک نظامِ حکومت کو تدریجاً بدلا جائے اور اسکی جگہ ساتھ ہی ساتھ دوسرا نظام قایم بھی کرتے چلے جائیں، موجودہ عمارت کی ایک اینٹ اکھڑے تو اسکی جگہ دوسری اینٹ لگا دی جائے۔ ایسی تبدیلی میں ہوتا یہ ہے کہ جب پہلا نظام ختم ہوتا ہے تو اسکی جگہ ایک نیا نظام قایم ہو چکا ہوتا ہے جب پرانی عمارت کی آخری اینٹ اُکھڑتی ہے تو اسکی جگہ ایک جدید عمارت بھی بن چکی ہوتی ہے۔ ایسا انقلاب دراصل آئینی تبدیلی (Constitutional Change) ہوتا ہے۔ اس قسم کی تبدیلی میں اگر کوئی آپ سے کہے کہ جب تک پہلی عمارت منہدم نہ ہو جائے اسوقت تک بالکل خاموش رہو اسکے کامل انہدام کے فیصلہ ہو جائیگا کہ تمہارے لیے کہاں منبر بننا چاہیے اور کہاں محراب اور عمارت

کا رُخ کعبہ کیطرف ہونا چاہیئے، یا کاشی کی طرف، تو کہیئے! یہ تجویز کتنی معقول ہوگی؟

یہ بات کس سے پوشیدہ ہے کہ ہندوستان میں پہلی قسم کا انقلاب نہیں بلکہ دوسری قسم کی آئینی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اور تخریب کے ساتھ تعمیر کا کام بھی جاری ہے، کانگرس کے صدر مسٹر سوبھاش چندر بوس فرماتے ہیں:-

"کانگرس محض تخریبی طریق عمل پر اعتقاد نہیں رکھتی، بلکہ اندر رہ کر تعمیری طریق عمل کو انسب سمجھتی ہے۔ (ٹریبیون مورخہ ۱۵ ۶/۳۸)

اس سے بھی صاف الفاظ میں سُنیئے مسٹر ایم۔ این۔ رائے کہتے ہیں۔

"اسمبلیوں میں جانے کا پروگرام اختیار کرنے کے بعد بالخصوص وزارتیں قبول کرنے کے بعد کانگرسی سیاست تیزی کے ساتھ دستوریت (Canstitutionalism) کیطرف ترقی معکوس کر رہی ہے اور برطانوی امپیریلزم سے لڑنے کی انقلابی ذہنیت کافور ہو گئی ہے"۔ (ٹریبیون مورخہ ۱ ۵/۳۸)

اور آجکل فیڈریشن کے متعلق جس قسم کے بیانات مسٹر ستیہ مورتی شائع کر رہے ہیں وہ خود بتا رہے ہیں کہ ہوا کا رُخ کدھر کو ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اسی قسم کی مثالیں نہ بھی پیش کی جائیں تو بھی یہ امر کس سے پوشیدہ ہے کہ ہندوستان میں انقلاب نہیں ہو رہا بلکہ آئینی تبدیلی ہو رہی ہے اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ہندوؤں کا منشا یہی ہے کہ انگریز کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ تو انگریز کا یہ اخراج اس طرح عمل میں لایا جا رہا ہے کہ جس دن انگریز کا نظام حکومت ختم ہو۔ اسی دن اسکی جگہ۔ ایک دوسرا نظام مکمل طور پر ملک پر مسلّط ہوگا۔ ہندی سیاست کی تقسیم عمل آج یوں ہو رہی ہے کہ مسلمان سے کہا جاتا ہے کہ تم انگریز کا بستر بند ہوانے میں لگے رہو۔ اور خود اُس جگہ اپنا بستر بچھاتے چلے جا رہے ہیں کوئی آنکھوں والا تو اس فریب میں مشکل ہی سے آسکے گا!

دوسری دلیل

پھر جیسا کہ ہم کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں۔ دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ انگریز یہاں سے نکلجائیگا

تو اسکی قوت گھٹ جائیگی اور اس طرح عالمِ اسلامی کی سیاست پر اسکا نہایت عمدہ اثر پڑے گا. لیکن ہم اسے بھی بار بار واضح کر چکے ہیں کہ ہندوؤں کا قطعاً یہ منشا نہیں ہے کہ انگریز کمزور ہو جائے بلکہ وہ تو اسکے طاقتور مددگار رہنا چاہتے ہیں۔ سُنیئے کہ پنڈت جواہرلال نہرو جنہوں نے پراگ میں فرمایا تھا کہ "انگلستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں" (ٹریبیون مورخہ ۱۹ ۳۸/۹) ہندوستان پہونچکر کیا فرماتے ہیں۔

"اگر برطانیہ جمہوریت کا اب بھی معتقد ہے تو اسکے لئے ایک ہی ممکن العمل صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ قیصریت کو جلد از جلد ترک کر کے ہندوستان اور فلسطین وغیرہ میں آزاد جمہوری ادارے قائم کر دے۔ اس سے برطانیہ کمزور نہیں ہوگا. بلکہ یہ ممالک اسکے طاقتور مددگار رہنجا ئینگے۔" (نیشنل ہیرلڈ۔ مورخہ ۴ ۳۸/۱۱)

---

(۲) خدا کا نمائندہ

پیر الٰہی بخش صاحب وزیر مالیات سندھ فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ میں ایک مسلمان ہوں. لیکن میں آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں کرسیِ وزارت پر بیٹھتا ہوں تو میں نہ مسلمان ہوتا ہوں نہ ہندو۔ میں اسوقت خدا کا نمائندہ ہوتا ہوں۔ اور ہر ایک سے انصاف کرتا ہوں" (نیشنل ہیرلڈ مورخہ ۲۶ ۳۸/۱۱)

گویا ایک مسلمان، مسلمان ہوتے ہوئے نہ خدا کا نمائندہ ہو سکتا ہے نہ ہر ایک سے انصاف کر سکتا ہے! یہ حضرات ایسے ایسے ذمہ دار عہدوں پر تو فائز ہو جاتے ہیں. لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اُسکا مطلب کیا ہے؟ مقصد پیشِ نظر بس ایک ہے اور وہ یہ کہ کہیں ہندو انکو "تنگ نظر" نہ سمجھ لیں اور یوں آبگینۂ وزارت کو ٹھیس لگ جائے۔ اے کاش کوئی بھُولے ہوئے مسلمان کو پھر سے یہ نکتہ بتادے کہ:۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ ۶۳/۸

(سچی عزت سب اللہ اور اُسکے رسول اور مومنین کے لیئے ہے۔)

(۳) مُرغِ حرم اور دانۂ گندم

زیرک شکاری خود گھات میں بیٹھتے ہیں اور کچھ لوگوں کو اس کام پر متعین کر چھوڑتے ہیں کہ وہ شکار کو اِدھر اُدھر سے گھیر کر اُن کی زد میں لاتے رہیں، دورِ حاضرہ کی سیاسی شکارگاہ میں یہ فریضہ کانگرس کے شعبۂ اسلامیات کو تفویض کیا گیا ہے جسکے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب ہیں اس شعبہ کا کام یہ ہے کہ جونہی یہ دیکھیں کہ مُسلمان ہندوؤں کی زد سے باہر ہو رہے ہیں۔ فوراً ردی کا سوال پیدا کر کے مُرغانِ حرم کے سامنے دانہ بکھیر دیں، پچھلے دنوں لیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ علماء کی وساطت سے مسلمانوں کو اس امر سے آگاہ کیا جائے کہ اُن کی تنظیم، اجتماعیت، مرکزیت محض سیاسی مسائل ہی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ یکسر مذہب پر مبنی ہیں۔ اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلم و غیر مُسلم دونوں ملکر ایک قوم بنجائیں۔ اِس قرارداد کے متعلق شعبۂ مذکورہ کا ترجمان "ہندوستان" اپنی ۱۱ دسمبر کی اشاعت میں رقمطراز ہے۔

> لیگ کا یہ پیتیرا بڑا خطرناک ہے، ہمارے مُسلمان عوام سیاست سے ناواقف ہیں وہ نہیں جانتے کہ مُسلمان کاشتکار اور مُسلمان زمیندار میں کیا بُنیادی لڑائی ہے۔ اگر ہم اسوقت خاموش رہے اور لیگی علماء کو فتوؤں کی لڑائی لڑنے کا موقع دیدیا تو پھر مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنا مشکل ہو جائیگا۔ اور دوسری طرف یہ فتوے ہندو مسلم فساد کو ملک کے کونے کونے میں پھیلا دینگے۔
>
> ہم کو بہت تیزی سے یہ سوال اُٹھا دینا چاہئیں کہ:۔
>
> مُسلمان کاشتکار اور مسلمان زمیندار کیسے بھائی بھائی ہو سکتے ہیں جب کہ کاشتکار کی تباہی پر زمیندار کے عیش و عشرت کی بنیاد ہے۔ اسی طرح مُسلمان مزدور اور مُسلمان کارخانہ دار کیسے بھائی بھائی ہو سکتے ہیں، یہ ایسے سوالات ہیں کہ اگر اسی طرح بلا زیادہ سمجھائے بجھائے بھی اُنکا پروپیگنڈا کر دیا جائے تو مُسلم لیگ کے فتوے ختم ہو جائینگے اور اگر ہم اس کام میں چوک گئے تو مدّتوں ہمکو اسکا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

وہی "دانہ گندم"، جسکے متعلق مشہور ہے کہ حضرت آدم کو جنت سے نکالنے کا ذریعہ بنایا گیا تھا

---

(۴) اصطلاحاتِ علمیہ

صوبہ بہار میں ایک کمیٹی متعین کی گئی ہے کہ وہ ایک مشترکہ "ہندوستانی" زبان وضع کرے، دوران بحث میں یہ چیز بھی سامنے آگئی کہ اصطلاحاتِ علمیہ کس طرح وضع کیجائیں، چنانچہ قرار یہ پایا کہ ان اصطلاحات کے لیے ہندوستان کی زبانوں کے الفاظ ہی منتخب کیے جائیں سینسکرت، فارسی اور عربی کے الفاظ نہ استعمال کیے جائیں، اور اگر ہندوستان کی زبانوں میں کوئی موزوں لفظ نہ ملے تو پھر مغربی ممالک سے اُن کی مروجہ اصطلاحات کو لے لیا جائے۔ (اسٹیٹس مین مورخہ ۱۲/۳۸ ۲۲)

یہ تو ظاہر ہے کہ اس قرارداد میں سنسکرت کا لفظ محض برائے بیت آگیا ہے۔ اِسلیئے کہ آج ہندوستان میں کوئی علمی اصطلاح ایسی نہیں جسکے لیئے سنسکرت کا لفظ استعمال ہوتا ہو جس زمانہ میں دنیا علوم و فنون سے روشناس ہوئی ہے۔ سنسکرت اِس سے کہیں پہلے مُردہ زبان ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں علمی اصطلاحات تمام کی تمام عربی زبان میں مروج ہیں (اور مغربی ممالک میں بھی کئی ایک علمی اصطلاحات کی ماخذ عربی زبان ہی ہے) اِسلیئے کھلے لفظوں میں اِس قرارداد کے یہ معنی ہوئے کہ مروجہ عربی اصطلاحات کو جلاوطن کردیا جائے اور اُن کی جگہ ملکی زبانوں میں کوئی لفظ ملجائے تو ہوالمراد۔ ورنہ یورپ سے مانگ کر لایا جائے۔ یہ ملیکشوں کی بھاشا جو قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے"! (مہاتما گاندھی) بھارت ماتا کے کانوں کو اپوتر نہ کردے۔

اللہ اکبر! سات سمندر پار ہندوستان کو غلام بنانے والوں کی زبان کا لفظ استعمال کرنا پڑے تو جائز لیکن ہندوستان میں بسنے والوں کی مروجہ اصطلاحات کا زبان پر لانا مہا پاپ۔ اسلیئے کہ وہ مسلمانوں کی زبان کے الفاظ ہیں۔

اس "ہندوستانی کمیٹی" کے ایک رُکن مولانا ابوالکلام آزاد بھی ہیں۔ سُنیئے کہ عربی اصطلاحات کے متعلق کبھی انکا کیا خیال تھا۔

"لوگ معترض ہیں کہ مصطلحاتِ اُردو کے لیئے عربی کی مراعات استحقاق پر میں کیوں زور دے رہا ہوں، یہ کیوں ضروری قرار دیا جا رہا ہے کہ حتی الامکان عربی کے الفاظ اُردو کی ادبیات علمیہ میں استعمال کیئے جائیں لیکن شاید یہ نکتہ اُن کی نگاہوں سے مخفی ہے کہ صرف عربی ہی نہیں، بلکہ ہر علمی زبان اپنی ماتحت زبانوں کے لیئے ایسی ہی حقوق کا مطالبہ رکھتی ہے ..... اصطلاحاتِ حدیثہ کا سوال جانے دیجیے مسلمان آج تمام اطراف عالم میں پھیلے ہیں، اُن کی زبان ہر جگہ ایک نہیں ہے لیکن مصطلحاتِ دینیہ اور علمیہ اب تک ایک ہیں، اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ پھر کوئی سبب نہیں کہ تیرہ سو برس کا استحقاق آئندہ کے لیئے اِس سے سلب کر لیا جائے۔ عربی اُم لغتِ اسلامیہ ہے زندہ ہے اور اپنے بچوں کی پرورش کے لیئے کافی اسباب و سامان اپنے پاس رکھتی ہے۔"

(الہلال مورخہ ۱۵ ۱/۱۳)

جس "اُم لغتِ اسلامیہ" کے حقوق کے تحفظ میں کبھی مولانا صاحب یوں سینہ سپر نظر آتے تھے، آج اُس "مادرِ مہربان" کا اپنے ہاتھوں سے جنازہ نکالا جاتا ہے اور اُس کا نام رکھا جاتا ہے، جذبۂ حریتِ ملت

گلۂ جفائے وفانما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری" (اقبال)

ہندوؤں سے کیا شکایت! بلکہ اُن کی تنگ نظری جو آنے والے ہندوستان (Future India) کی فلم کا ایک بولتا۔ گاتا پیش رَو Trailor ہے۔ اہلِ بصیرت کے نزدیک مسلمانوں کے لیئے عمدہ شگون ہے، ماتم تو اِس کا ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے کرایا جا رہا ہے۔

از باغبان شداست کہ صیاد آن نکرد

---

(۵) جنّاتی زبان

"آگرے میں سماج وادی بہاشنٹر اکیل بھارتیہ سماج وادی نیتاؤں کے دوارا"

ہمیں جنتا کو یہ سوچنا دیتے ہوئے پر سنتا ہوتی ہے کہ .... اکیل بھارتیہ شوشلسٹ نیتاراج کے اینک وشوں پر اپنے سناگرھت اور دوتاپورنر بھاشنٹر دینگے۔ آگرہ کی جنتا کے لیے یہ ابور ردا دسرہے کہ دے دیش کے شوشلسٹوں کے سمپرک میں آکر سمجھ لیں کہ برٹش سامراج داؤکوکس پرکار اُکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔ بھاشنٹروں کے وشے .... پونجی واد۔ ورک بندہ۔ سامراجیہ داؤ۔ دشو شانتی کی سمسیا۔ ودیارتھی آندولن ...... ستر سمبقت آدی"۔

جل توجلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو

ڈرنے کی کوئی بات نہیں! یہ کوئی کالاعلم نہیں۔ بلکہ ایک اشتہار ہے جو آگرہ کی سوشلسٹ کانگرس پارٹی کی طرف سے ایک جلسہ کے متعلق شائع ہوا ہے۔ یہ ہے وہ زبان جسکے متعلق صوبہ بہار کی ہندی ساہتیہ سمیلن کے سولھویں اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ریورینڈ راہل سنکرتیاینہ صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

"ہندی۔ ہندوستان کی قومی زبان ہے اور اس زبان کی نشو وارتقا کے سلسلہ میں جو تحریک جاری ہے اسکے پیچھے کوئی مذہبی یا فرقہ وارانہ جذبہ کارفرما نہیں۔ امتداد زمانہ سے مذاہب توروئے زمین سے مٹ جائینگے لیکن ہندی زبان اُنکے بعد بھی باقی رہیگی"۔

(اسٹیٹس مین مورخہ ۱۹ ۱)

مذاہب کے متعلق تو خیر آنے والا زمانہ فیصلہ کریگا لیکن اتنا یقینی ہے کہ ذوق سلیم اور احساسات لطیفہ کو یہ "کالی ماتا" کبھی نہیں چھوڑیگی۔ جب "ست جگ" کی تہذیب کا احیا ہوگا تو "کل جگ" کی تمام بدیشی چیزیں مٹا دی جائیں گی۔

محو حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

بصائر

(دیباچہ دوم)

توبہ کا مفہوم

جنگِ بویب میں جو ۱۳ھ میں ایرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی۔ جیوشِ اسلامی کے امیر حضرت مثنیٰ تھے۔ اور دوسری طرف رستم نے مہران کو جنے عرب میں تربیت پائی تھی، فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔ فریقین جب میدان میں آمنے سامنے صف آرا ہوئے تو اسلامی فوج میں قاعدہ یہ تھا کہ امیر تین بار نعرۂ اللہ اکبر بلند کرتا، پہلے نعرہ پر فوج مستعد دوسرے پر آمادۂ پیکار اور تیسرے پر حملہ آور ہوتی۔ حضرت مثنیٰ نے بعض مجاہدین کو دیکھا کہ وہ دوسری ہی تکبیر پر صف سے یوں آگے بڑھنے لگے گویا ؎

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا

یہ چیز عسکری نظام کے خلاف تھی۔ فوج کے سپاہی کو تو ہر اشارہ کے مطابق نقل و حرکت کرنی چاہیئے آپنے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے! لوگوں نے کہا کہ گزشتہ واقعہ میں ان سپاہیوں کے قدم میدان جہاد سے اکھڑ گئے تھے۔ انکے دل پر اس لغزش کا احساس اسقدر غالب ہے کہ آج اسکے کفارہ میں شہادت کے لیئے یوں بیتاب ہو رہے ہیں۔ فرطِ مسرت سے حضرتِ مثنیٰ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ لیکن انہیں نیزہ سے دبا کر صف میں کھڑا کیا اور کہا کہ اپنی اپنی جگہ پر جمے رہو۔ جب دشمن آگے بڑھے تو اسے روکو اور بلا وجہ جائیں نہ دو۔ انہوں نے عرض کیا کہ جب تک ہم اپنی جانیں اللہ کی راہ میں نہ دیدینگے، اسوقت تک گناہوں سے پاک نہیں ہو سکتے۔ اسوقت تو صفوں میں اپنی اپنی جگہ پر آگئے۔ لیکن بالآخر بیدریغ حملہ کیا۔ اور ان میں سے ہر ایک شہادت سے سرخرو ہوا یہ تھا گناہ کا احساس اور یہ تھی ان پاک روحوں کی سچی توجہ! رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

(تاریخ الامت)

لیکن مسلمان مجاہدین کا یہ ذوقِ شہادت نہ توکسی ذاتی غرض کے لیئے تھا اور نہ ہی جذبہ جوع الارض پر مبنی۔ یہ کس غرض و غایت کے لیئے تھا۔ اسکے لیئے ایک غیر مسلم کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

عرب فوجیں یلغار کرتی ہوئی فرانس کے دروازے پر پہونچی تھیں تو کیوں؟ فتح و ظفر و دولت کے لیئے نہیں، ملک گیری اسلام کا مقصد نہ تھا۔ اِسکا مقصد حُریت و آزادی کی اشاعتِ عمومی اور غلامی کا استیصال تھا، آج کل ہم ملکی طاقت کے لیئے مرتے ہیں اور علاقوں کا رونا روتے ہیں، مگر اسلام کا مطمحِ نظر کوئی ملک یا صوبہ یا خطّہ نہ تھا۔ بلکہ اسکا مقصد ساری دُنیا کی نجات تھا اور مسلم داعی یہی دُھن لے کر ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے۔ عربوں نے صرف ملک کی زمینیں فتح نہیں کیں، بلکہ دل و دماغ فتح کیئے، انہوں نے قوموں کے لٹریچر اور خیالات کو متاثر کیا۔ ہمارے (اہل ہنود) کے وہم و خیال کو حقیقت کا جامہ مسلمانوں نے پہنایا، ہمارے افکار و تخیلات میں حرکت اور جان انہوں نے ڈالی، مسلمانوں نے دُنیا میں علوم و فنون کی بے شمار خدمات سرانجام دی ہیں۔ اخلاق۔ فیاضی۔ اور مردانگی ہمیشہ اُن کی قومی خصوصیات رہی ہیں انہوں نے ہندوؤں کی طرح اشاعتِ علوم میں کبھی بخل نہیں روا رکھا۔ ہمیشہ بنی نوعِ انسان کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں۔"

(مسز سروجنی نیڈو، بحوالہ اخبار وکیل مورخہ ۲۶)

---

(۲) ماحصلِ تہذیب

ہسپانیہ کی خانہ جنگی کو قریب اڑھائی سال ہو چکے۔ سرزمین چین بھی کئی مہینوں سے انسانیت کے خون سے لالہ زار بن رہی ہے۔ فلسطین کی ارضِ مقدس سے ایک عرصہ سے شعلے اٹھتے دکھائی دیرہے ہیں۔ یورپ سے خبریں آرہی ہیں کہ تمام ممالک سامان حرب کی تیاری میں دن رات

مصروف ہیں۔ اکیلے جرمنی میں دس ہزار حربی طیارے موجود ہیں اور قریب بارہ سو فی ماہ کے حساب سے اور تیار ہو رہے ہیں: دیگر اقوام مغرب کی تیاریوں کا اسی سے اندازہ لگا لیجئے، آسمان سے آگ زمین سے آگ۔ ہوا سے آگ۔ پانی سے آگ۔ جسموں کے باہر آگ۔ دلوں کے اندر آگ۔ یہ ہے ماحصل اس تہذیب نو کا جس کی درخشندگی اور تابناکی یوں نگاہوں کو خیرہ کئے جا رہی ہے۔ کیا سچ فرمایا ہے حکیم الامت رح نے ؎

انساں کہ رُخ ز غازہ تہذیب بر فروخت　　　خاکِ سیاہ خویش چو آئینہ وانمود
پوشید پنجہ را تہ دستانۂ حریر　　　افسونیِ قلم شد و تیغ از کمر کشود
ایں بوالہوس صنم کدۂ صلح عام ساخت　　　رقصید گرد او بنوا ہائے چنگ و عود
دیدم چو جنگ پردۂ ناموس او درید
جز "لیسفک الدماء و خصیم مبین" نبود

عید قرباں

(اسدؔ ملتانی)

شعلۂ عشق! جلا دے خس و خاشاک مجاز
کہ حقیقت کا ذرا رنگ نمایاں ہو جائے

حُسنِ یکتا کے تصور سے ہی جمعیتِ دل
زلفِ کثرت میں جو اُلجھے تو پریشاں ہو جائے

وعظ و تفسیر کی حاجت نہ رہے اے واعظ
زندگی تیری جو آئینۂ قرآں ہو جائے

کیا تماشا ہے کہ ہم آپ تو کوشش نہ کریں
اور یہ چاہیں کہ کوئی غیب سے ساماں ہو جائے

آپ کہتے ہیں کہ کافر کو بنائیں دیں دار
میں یہ کہتا ہوں مسلماں تو مسلماں ہو جائے

نیکی اپنے لئے کرتے ہیں سب انساں لیکن
چاہتے یہ ہیں کہ اللہ پہ احساں ہو جائے

جانور جس نے کیا ذبح، یہ لازم ٹھیرا
جب ضرورت ہو تو خود آپ بھی قرباں ہو جائے

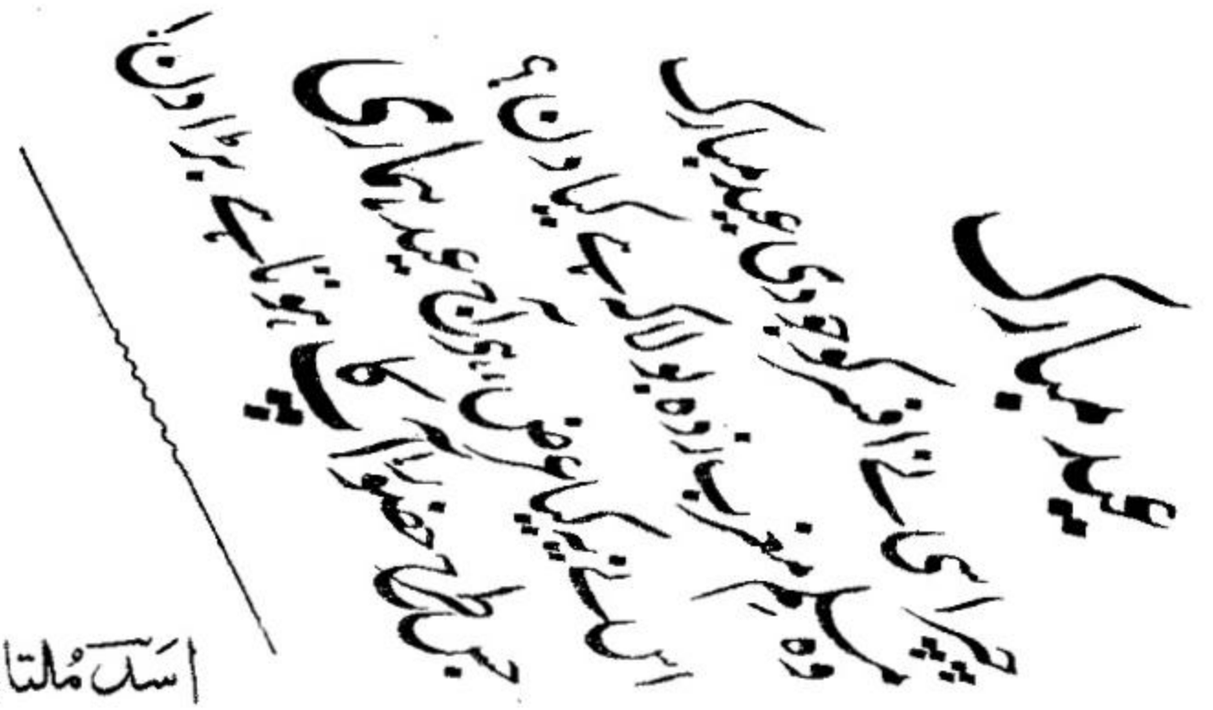

حضرت علامہ اقبالؒ سے آخری مُلاقات

چودہری غلام احمد صاحب پرویز

۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء کی درمیانی شب، گذشتہ سال کی ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ گذری ہوئی کہانیاں ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں جس طرح کوئی چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا چاند کے سامنے سے گذرے تو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ چاند دوڑ رہا ہے یا بادل۔ اسی طرح دن گذرتے جاتے ہیں اور یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا زمانہ۔ ڈائری کے اوراق سے بعض بھولے ہوئے افسانوں کی یادیں تازہ ہوتی جا رہی تھی جس طرح عرق لیموں سے لکھے ہوئے حروف کاغذ کو آگ کے سامنے رکھنے سے خود بخود اُبھرتے چلے آتے ہیں۔ ابھی چند ورق اُلٹنے پایا تھا کہ ۱۰ جنوری کے صفحہ پر ایک ایسا واقعہ مندرج پایا جس نے نگاہوں کو وہیں روک لیا، اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ کسی واقعہ کی یاد نہیں بلکہ ایک مضراب ہے جس نے بربطِ ہستی کے تاروں کو یوں چھیڑ دیا ہے کہ ان کے اندر سوئے ہوئے المیہ نغمات پھر سے بیدار ہو رہے ہیں۔ اور شعلہ ریز دیپک کے سُروں میں تمام کائنات پر چھائے جا رہے ہیں۔ واقعہ کی تمہید یوں ہے کہ ۹ جنوری کو "دہلی کا قافلہ" زیر امارت مولانا محمد اسلم صاحب جیراج پُوری بتقریب "اقبال ڈے" لاہور پہونچا۔ رات تک مصروفیت رہی۔ ان اجلاس کا تذکرہ بھی ڈائری میں لکھا پایا لیکن ۱۰ جنوری کی صبح کے واقعہ کی تفصیل جو ڈائری کے کئی ایک صفحات پر پھیلی ہے کچھ ایسی وجد انگیز ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بزم طلوع اسلام کو بھی اس حظ و کیف میں شریک کر لوں بہتر ہو کہ اسے ڈائری کے الفاظ میں ہی سُنیئے۔

۱۰ جنوری بروز سوموار

"صبح ۹ بجے جاوید منزل واقعہ میور روڈ پر حاضر ہوئے۔ نذیر نیازی صاحب حسب وعدہ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ حضرت علامہ پلنگ پر استراحت فرما رہے تھے۔ لحاف اُوڑھے ہوئے بلکہ لحاف کے ساتھ ایک کمبل بھی ملفوف تھا۔ حقہ سامنے تھا جو ہمیشہ سامنے رہتا ہے۔ نیازی صاحب نے بتایا کہ جب پچھلے دنوں لارڈ لوتھین ملنے کے لئے آیا، تو بھی آپ اسی انداز میں لیٹے لیٹے ملے تھے۔ آواز ابھی تک صاف نہیں ہوئی۔ اس طرح بولتے

ہیں جیسے کسی کی گھگھی بندھ رہی ہو۔ مولانا صاحب کی وجہ سے سلسلۂ گفتگو اُردو میں چھڑا۔ لیکن آپ کے لب و لہجہ سے حسب معمول "پنجابیت" صاف نمایاں تھی جسے وہ کسی تکلف کے پردہ میں چھپانا نہیں چاہتے، عمر قریب ساٹھ برس سمجھیے۔ لیکن اس دفعہ کمزور ہو رہے تھے، بایں ہمہ اس کمزوری اور بڑھاپے میں بھی دبدبہ اور عظمت کی وہی شان تھی۔ لیکن سادگی اتنی کہ اگر کسی کا پہلے تعارف نہ ہو تو وہ شاید ہی سمجھے کہ کسی لکھے پڑھے آدمی کے سامنے بیٹھا ہے۔ پہلے متفرق سلسلۂ کلام شروع ہوا۔ آپ کی باتوں میں ہلکی سی ظرافت کی چاشنی جسے ظرافت کی بجائے شگفتگی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ لیکن آج کل آپ کی علالت کی وجہ سے یہ ضرورت بھی رہتی ہے کہ سنجیدہ گفتگو کو یہاں وہاں سبک رو کر دیا جائے۔ ضمناً ایک بات سامنے آگئی فرمایا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے جب واپس آرہے تھے تو مولوی ..... صاحب بھی ساتھ تھے۔ میں عرشہ جہاز پر کانفرنس کی روئداد دیکھ رہا تھا کہ کتاب ہاتھ سے گر گئی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں عرب لڑکے جہاز کے ساتھ ساتھ آرہے تھے، مولوی صاحب کو عربی آتی نہیں تھی، گھبراہٹ میں آواز دی کہ یا شیخ! ذالک الکتب لا ریب فیھا۔ وہ سمجھ گئے اور کتاب جو اتفاق سے ایک کشتی میں جا گری تھی اُٹھا لائے۔

جاوید نامہ کے متعلق کچھ ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ دربار فرعون کے ساحر جنکی قوت ایمانی استبداد فرعون کا زندان شکن جواب ہے۔ انہیں جاوید نامہ میں ضرور جگہ ملنی چاہیئے تھی، فرمایا کہ جاوید نامہ میں تو بہت سی چیزیں لکھنے سے رہ گئیں۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سید احمد (بریلوی) اور سید احمد دہلوی (سرسید) کی روحوں کو بھی اکٹھا کر دوں۔ یہ بھی نظر انداز ہو گیا اور بھی بہت سی باتیں میں نے نوٹ کر کے رکھی تھیں۔ اب کسی اور موقعہ پر ان کو لکھوں گا۔

میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں اس منزل کے بعد دوسری منزل کے لئے جہاں ایک طرف انسانوں کے متعلق یہ آیا ہے کہ والیٰ ربھم ینسلون (وہ اپنے رب کی طرف دوڑتے ہوئے جائینگے) دوسری طرف خدا کے متعلق بھی ہے کہ وجاء ربک والملک صفًّا صفًّا۔ (کہ تیرا رب اور فرشتے صف در صف آئیں گے)۔ گویا خدا خود اس زمین پر آئے گا اور اشرقت الارض بنور ربھا (زمین اس کے رب کے نور سے جگمگا

اُٹھے گی) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ ڈراما کچھ اور سین اسی اسٹیج پر دکھائے گا۔ فرمایا کہ یہ درست ہے لیکن ارض و سما اور پستی و بلندی کا تصور تو موجودہ شعور کے تابع ہے جب شعور بدل جاتا ہو تو زمان و مکان Time and space کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ اگلی منزل میں شعور بدل جائے گا۔ کیا معلوم ارض کیا ہو اور سما کیا ہو یا دونوں ایک ہی ہوں۔ اسی لئے تو فرمایا کہ یوم تبدل الارض غیر الارض والسموات (جس دن یہ ارض و سموات بدل جائیں گے) شعور کی ارتقائی منازل کا تقاضا ہے کہ زمان و مکان کے بُعد باقی نہ رہیں خواب میں دونوں چیزیں باقی نہیں رہتیں۔ نہ وقت کوئی شے رہتا ہے نہ مکان۔ ایک سکنڈ کے خواب میں ایک شخص بارہ برس تک امریکہ بھی رہ آتا ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ کیا معلوم کہ دوسرے شعور میں کیفیت و کمیت کا کیا عالم ہو۔

فرمایا کہ جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو Time کے نظریہ پر ایک مقالہ لکھ کر اپنے اُستاد Metaggart کے پاس لے گیا، اُس نے کہا کہ یہ کیا لکھ دیا؟ اس پر لوگ ہنسیں گے۔ میں نے اُسے ضائع کر دیا۔ ایک عرصہ کے بعد جب برگسان کے نظریئے شائع ہوئے تو اُن میں ٹائم کے متعلق وہی کچھ تھا جو میں نے لکھا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے مقالہ کے ضائع کر دینے کا بڑا افسوس ہوا۔ اس لئے کہ میرے مقالہ سے قرآن کریم کی حقیقتِ ثابتہ سامنے آجاتی تھی۔

اس کے بعد برگسان نیٹشے اور اپنے فلسفہ کے اختلافات کی توضیح فرماتے رہے۔ اور بتایا کہ وہ فلسفہ جس کا سرچشمہ علم الٰہی ہو کس طرح ایک یقینی شے بن جاتی ہے اور وہ فلسفہ جو محض انسانی دماغ کا رہین منت ہو کس طرح ظن و قیاس کی وادیوں میں سرگرداں رہتا ہے اور جب کبھی اسے یقین کا رتبہ حاصل ہوتا ہے، تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہو۔ آپ یہ کچھ بیان فرما رہے تھے اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کسی نئی دنیا میں ہیں اُس وقت معلوم ہوا کہ ذہن انسانی کی وسعتیں کس قدر حدود نا آشنا ہیں۔ اور یہ ہستی جسے دُنیا نے محض ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانا ہے علم و ادراک کی کن بلندیوں پر ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پاؤں تک دماغ ہی دماغ ہے اور دماغ بھی ایسا جو ثریا سے ورے کی بات ہی نہ جانتا ہو۔ بڑے بڑے اہم حقائق اور ادق مسائل کو دو دو جملوں میں صاف کرتے جاتے تھے۔

پھر قرآن کریم کے متعلق ذکر آ گیا، فرمایا کہ جب میں الیف، اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا، والد مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی جاری ہوتی۔ ایک دن آ کر پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھتے تھے؟ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آ گیا کہ چھ مہینے ہو گئے۔ ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہوں۔ پھر یہ سوال کیسا ہے! نہایت نرمی سے فرمایا کہ میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ میں بھی آتا ہے؟ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا۔ اور کہا کہ کچھ عربی جانتا ہوں۔ کہیں کہیں سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بات ختم ہو گئی۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بیٹا قرآن کریم اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ میں حیران تھا کہ کیا نبی اکرمؐ کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا؟ فرمایا کہ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآن کریم حضورؐ کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ میں پھر حیران تھا؟ فرمایا کہ انسانیت کو جس معراج پر پہونچانا فطرت کا مقصود ہے۔ اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمدؐ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے، حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ تک ہر ایک نبی محمدؐ ہی کے مختلف مدارج تھے، وہ سلسلہ گویا Mohammad in the making تکمیل محمدؐ کے منازل تھے۔ بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا۔ البتہ شعور انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی حتیٰ کہ محمدؐ مکمل ہو گیا۔ باب نبوت بند ہو گیا۔ انسانیت اپنے معراج کبریٰ تک پہونچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراج انسانیت کا نمونہ محمدؐ ہے، کوئی انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآن کریم اس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا کہ قرآن کریم اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر یہ نازل ہونا شروع ہوتا ہے۔

یہ تو تھی قرآن کریم کے قلب کے راستے سمجھ میں آنے کی صورت۔ دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کے متعلق حضرت علامہؒ نے فرمایا کہ قرآن فطرت اللہ ہے۔ یعنے دنیا میں مختلف اوقات میں مختلف حقائق ظاہر ہوئے کوئی یہاں کوئی وہاں، ہر حقیقت فطرت اللہ ہوتی ہے۔ ان حقائق کے منتشر اوراق ایک جگہ جمع کر دیئے اس مجموعہ کا نام ہے قرآن کریم۔ اب بھی جہاں کہیں کوئی حقیقت ظاہر ہو گی وہ لینن کے الفاظ میں ہو، یا سنوسی کے۔ قرآن ہی کی کسی آیت کا ترجمہ ہو گا۔ اس لئے کہ حیات انسانی کے لئے جس قدر حقائق کی ضرورت

تھی وہ سب کے سب اس کے اندر آچکے ہیں۔ اب قرآن کریم کو اس طرح سمجھنا چاہیئے جس طرح یہ دنیا کو ملتا چلا آیا ہے۔ کبھی ایک حقیقت کسی زرتشت کو ملی تھی، کہیں کسی بدھ کو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے پہلے ان تمام مذاہب کو دیکھئے۔ وہاں نظر آجائے گا کہ حقائق کون کون سے ہیں۔ اور افسانے کون کون سے۔ حالانکہ اس مذہب والے ان افسانوں کو بھی حقائق ہی سمجھتے ہونگے ان کے حقائق قرآن کریم میں موجود ہونگے اور ان کے افسانوں کی تردید ہوگی یہ افسانے انسانی دماغ کے وضع کردہ ہونگے جب تک ان افسانوں سے واقفیت نہو معلوم نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کس چیز کی تردید کر رہا ہے مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ ہم نے ارض سماء کو لاعبین In Sport کھیل کود میں پیدا نہیں کیا۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ تمام کائنات ایشور نے ایک "لیلا" رچائی ہے۔ چنانچہ ان کے ایک خدا کا نام "نٹراجن" "کھلاڑیوں کا بادشاہ" ہے اس کی مورتی بھی ایسی ہے کہ وہ رنگ راگ میں مصروف ہے۔ اور دنیا پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس افسانے کی تردید لاعبین کے اندر ہے، یا مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ لا تأخذہ سنۃ ولا نوم (خدا کو اونگھ یا نیند نہیں آتی) ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ سب کائنات پرماتما کا خواب ہے جب وہ بیدار ہو جائے گا تو یہ خواب بھی پریشان ہو جائے گا۔ خود ہمارے ہاں بھی بعض صوفیا میں اس قسم کا تصور موجود ہے۔ اس افسانہ کی تردید قرآن کریم نے ان الفاظ میں کی ہے۔ لہذا قرآن کریم سمجھنے کے لئے پہلے اس قسم کے "افسانوں" کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ خالص حقائق اب قرآن کریم کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتے۔

رسول کی تعریف Definition کے متعلق فرمایا کہ ایک رسول میں اللہ کی طرف سے یہ شعور پیدا کر دیا جاتا ہے کہ وہ امتداد زمانہ Length of time سمیٹ کر ایک حال Present کے اندر مرتکز کر لے۔ لہذا جو باتیں دوسروں کے نزدیک دو ہزار برس بعد آنے والی ہوتی ہیں وہ رسول کے سامنے زمانہ مستقبل کی نہیں بلکہ حال کی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی وحی میں اس قدر محکم یقین رکھتا ہے کہ اس کی سچائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ وہ ان کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں شک و ریب کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

سیاستِ حاضرہ کے متعلق بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ فرمایا کہ مجھے تو نظر آتا ہے کہ انہی عوام میں سے کوئی صاحبِ ایمان کھڑا ہو جائے گا، اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لے آئیگا۔ اسکی عملی شکل ان کے سامنے وہی ایک اسلامی ریاست (پاکستان) کا تصور ہے۔ فرمایا کہ اسکے سوا ہندوستان کی سیاست کا کوئی اور عملی حل سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ سب کچھ اقبال کے دماغ کے متعلق تھا لیکن حقیقی اقبال ان پردوں کے پیچھے قلب کی انتہائی گہرائیوں کے اندر چھُپا رہتا ہے۔ ہر چند نیازی صاحب نے کہہ رکھا تھا کہ کسی جذباتی چیز کا تذکرہ نہ چھیڑنا کیونکہ اس کا انکی صحت پر بے حد مضر اثر پڑتا ہے۔ لیکن ایک بات غیر ارادی طور پر ایسی آ گئی جس سے ہمیں حقیقی اقبال کی ایک جھلک دیکھنی بھی نصیب ہو گئی۔ مولانا صاحب نے دریافت کیا کہ آجکل کوئی تازہ کلام کہا گیا ہے انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ زخمہ کس تار پر جا لگے گا۔ فرمایا کہ گذشتہ چھ ماہ سے جب سے حج کا ارادہ ہوا ہے صبح سے شام تک مدینہ ہی کے راستہ میں رہتا ہوں جو کچھ کہتا ہوں وہ بھی کچھ وہیں کی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ کہا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، کچھ طبیعت سنبھلی تو فرمایا، بہت کچھ دل میں ہے کہ حضور کے آستانۂ اقدس پر پہونچوں گا تو یہ بھی عرض کروں گا وہ بھی، راستے طے کر لیتا ہوں لیکن جب وہاں پہونچتا ہوں تو طبیعت قابو میں نہیں رہتی۔ نیازی صاحب نے فرمایا کہ تازہ کلام سے کوئی شعر ان کو سناؤ۔ انھوں نے ایک شعر سنایا تو فرمایا کہ ہاں ایک شعر یاد آ گیا، کعبۃ اللہ میں پہونچ کر یہ حضورِ حق عرض کیا ہے کہ:-

تو باش این جا و با خاصاں بیامیز　　　کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

پہلا مصرعہ تو آسانی سے پڑھ دیا لیکن دوسرے مصرعہ میں "منزلِ دوست" تک پہنچے تو ایک عجیب کیفیت سامنے آئی۔ دیکھا کہ تمام جسم پر ایک ارتعاشی حالت پیدا ہو گئی ہے۔ لیٹے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ یوں محسوس ہوا کہ سارا کلیجہ اُمنڈ کر منہ میں بھر آیا ہے، گلا کھول گیا۔ چہرہ سُرخ ہو گیا، اسے بڑی مشکل سے یوں دبایا جیسے کسی چیز کو حلق سے نیچے لے جا رہے ہیں　بڑے کرب و اذیت کے بعد انتہائی اضطراب کے عالم میں بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگے، غش کی سی حالت ہو گئی اور نڈھال ہو کر لیٹ گئے۔

ہم ششدر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یا اللہ یہ کیا ہو گیا، ایک ہیبت سی طاری ہو گئی سارے کمرے میں سناٹا تھا۔ ہمیں رہ رہ کر افسوس آتا تھا کہ ہم نے کیوں اس مضمون کو چھیڑ دیا۔

کچھ دیر اور بیٹھے کہ اُنکی طبیعت سنبھل جائے۔ اجازت چاہی تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ ایک دن اور ٹھہرنے کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی! ہماری دفتر کی پابندیاں اسکی کب اجازت دیتی تھیں! طوعاً و کرھاً رخصت ہوئے دیکھا تو بارہ بج چکے تھے۔ تین گھنٹے گزر گئے اور یوں معلوم ہوا کہ شاید پانچ منٹ ہوئے ہیں۔

زندگی میں چند لمحات بعض اوقات حاصلِ زندگی بن جاتے ہیں، یہ چند لمحات اسی قسم کے تھے۔ اب کچھ سمجھ میں آیا کہ اقبال کہاں پہونچ چکا ہے۔ دماغ ہے تو عرش کی بلندیوں پر، اور قلب ہے تو عشقِ رسولؐ میں خاکستر! اے کاش مسلمانوں کی سمجھ میں آجاتا کہ اُنہیں فطرت کی کرم گستری نے کس قدر بیش بہا نعمت عطا فرمائی ہے!"

(مرقومہ ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء)

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملاقات میں جتنی باتیں ہوئیں اور جس طرح ہوئیں میں نے وہ سب اس یادداشت میں لکھ لی تھیں۔ بہرحال یہ تھے وہ تاثرات جو میرے ذہن میں باقی تھے جنہیں میں نے محفوظ کر لیا اُس وقت اس کی بھی کیا خبر تھی کہ یہ ملاقات آخری ہو گی۔ اور اس کے بعد عالم اسلامی کی یہ جلیل المرتبت ہستی ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے پنہاں ہو جائے گی۔ اس کمی کو کچھ وہی محسوس کر سکتے ہیں جنہیں کبھی حضرت علامہؒ کی خدمت میں باریابی کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔ آج تو اس قسم کی یادداشتوں کے اوراق ہیں، اور دل حرماں نصیب کی حسرتیں کہ:۔

دگر دانائے راز آید کہ ناید

پیامِ اقبال اور قرآنِ کریم

(مسلسل)

(چودھری غلام احمد صاحب پرویز)

عصر حاضر کے متعلق ارشاد ہے

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے ۔۔۔ مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا

روس اس لا کے جنون میں سب سے زیادہ شدت سے گرفتار ہے، اشتراکیت کی بنیاد ہی نفی سے شروع ہوتی ہے۔ خدا کی نفی، کلیسا کی نفی، املاک کی نفی، ملوکیت کی نفی، حکومت کی نفی (یعنے کمیونزم کے انتہائی دور میں)۔ عائلی زندگی کی نفی۔ تدبیر منازل کی نفی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض چیزوں کی نفی تھی بھی ضروری۔ لیکن محض نفی سے تو کام نہیں چل سکتا۔ نفی کے بعد اثبات کی بھی تو ضرورت تھی۔ توہمات کو چھوڑیئے تو حقائق پر ایمان لایئے۔ اس تفریط Extremism اس یکسر کفر (انکار) ہی کا تو نتیجہ ہے کہ دنیا بھر میں انقلاب کے مدعی خود اپنے اصولوں میں اس قدر عجلت سے تبدیلیاں پیدا کئے جا رہے ہیں کہ باریک بیں نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ پھر وہیں پہونچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے، روس کے متعلق ارشاد ہے:-

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ ۔۔۔ لا سلاطین - لا کلیسا، لا اِلٰہ
فکر او در تند بادِ لا بماند ۔۔۔ مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں ۔۔۔ خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات ۔۔۔ سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا ساز و برگِ اُمتاں ۔۔۔ نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں

دوہی صفحے پہلے ہے

نکتۂ می گویم از مردانِ حال ۔۔۔ اُمتاں را لا جلال، اِلّا جمال
لا و اِلّا احتسابِ کائنات ۔۔۔ لا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیر جہانِ کاف و نون حرکت از لا زاید از الا سکون

اس آخری مصرع کو غور سے دیکھئے۔ جب تک قومیں لا کے بحران میں رہتی ہیں عدم سکون و فقدان طمانیت کے گرداب میں چکر کھاتی ہیں کبھی محکم چٹان پر ان کا قدم نہیں جمتا۔ آج ایک نظریہ قائم ہوتا ہے، دنیا میں شور مچ جاتا ہے کہ بس وہ مداوا ہاتھ آگیا جس سے تمام دنیا کے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔ ابھی چار قدم بھی اس کی روشنی میں چلنے نہیں پاتے کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جسے تریاق سمجھ رہے تھے وہ زہر ہے جسے چشمۂ حیواں تصور کئے بیٹھے تھے وہ سراب ہے۔ اُسے ڈھا دیا جاتا ہے۔ اور پہلے کی طرح ایک اور فریب تیار کر لیا جاتا ہے۔ دو چار قدم اس کی روشنی میں چلتے ہیں۔ پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگ جاتے ہیں کُلَّمَآ اَضَاءَ لَھُمْ مَّشَوْ فِیْہِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْھِمْ قَامُوْا (۲/۲۰) جب ذرا بجلی کی چمک پڑتی ہے تو اس میں دو قدم چل لیتے ہیں، اور جب وہ روشنی غائب ہو جاتی ہے تو پھر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف تکنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے متذبذب زندگی کا وہ جہنم جس میں آج ساری دنیا گرفتار ہے اور نتیجہ ہے اس اِلّا کے نہ ہونے کا اس عملی شرک کا۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُہُ الطَّیْرُ اَوْ تَھْوِیْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ مَکَانٍ سَحِیْقٍ۔ ۲۲/۳۱

جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی حالت یوں سمجھئے کہ گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آ گرا۔ یا جیسے (مرغی کے چوزے کو) کوئی (عقابی پنجوں والا) پرندہ اُچک کرلے جائے یا جیسے تند و تیز ہوا کے جھونکے (پر کاہ کی طرح) اسے کسی دُور دراز مقام پر پھینک دیں +

گویا اس نظام کا مرکزِ ثقل گم ہو جاتا ہے جس میں لا ہی لا ہو۔ اِلّا نہ ہو۔ وہاں حرکت ہی حرکت ہوتی ہے، سکون نہیں ہوتا لیکن جم کر کھڑے ہونے کی مہلت نہیں ملتی۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ:۔

بجز دِ سرزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی مزی چوں خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

اس تعبیر کا سبق وہ ملت اسلامیہ کے ان نوجوانوں کو دیتے ہیں جو لاعلمی کی وجہ سے اس قسم کی نفی کی طغیانیوں میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام ہر کہ در ورطۂ لا ماند۔ بہ اِلّا نہ رسید

اوران مسلمانوں کو جو ہزار ہزار تسبیح پڑھنے کے باوجود۔ لاآلہ۔ الا اللہ کے معنے نہیں سمجھتے، پھر سے یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ ؎

کافرا دل آوارہ دگرباره باو بند برخویش کشا دیده واز غیر فرو بند
دیدن دگر آموز ندیدن دگر آموز

پھر سے سیکھ کہ لاؔ کہاں کہاں استعمال ہوگا اور الّا کہاں سے شروع ہوگا +

جب تک انسان لاؔ کے بھنور میں رہتا ہے۔ وہم وقیاس آرائیوں کا تختۂ مشق بنا رہتا ہے اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تذبذب اور گمان میں قلب انسانی کس جہنم میں رہتا ہے۔ اطمینان وسکون یقین میں ہے اور یقیں پیدا نہیں ہوسکتا جب تک اس سلبی لاؔ کے بعد ایجابی الاّ نہ آجائے اس کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

مومن خدائے لم یزل کا دستِ قدرت کیسے بنتا ہے۔ اس کی تفسیر دیکھنی ہو تو قرآن کریم میں واقعۂ بدر دیکھئے۔ کہتے ہیں کہ واٹرلو کی لڑائی نے یورپ کی تاریخ بدل دی لیکن جن کی نگاہیں دوررس اور دقیقہ شناس واقع ہوئی ہیں، اُن کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہے کہ بدر کی لڑائی نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔ اگر اس وقت خدانکردہ مسلمان مجاہدین کی وہ مٹھی بھر جماعت جو اونٹوں کی پسلیاں اور کھجوروں کی ٹہنیاں لے کر سر بکف میدان میں آگئی تھی کہیں ضائع ہوجاتی تو آج دنیا پر توہم پرستی کے گھناونے بادل منڈلا رہے ہوتے، اور کوئی نہ جانتا کہ علم وعقل، شعور وادراک، حکمت وفلسفہ کیا شے ہے۔ اور کوئی نہ پہچانتا کہ انسان کی اس دنیا میں صحیح پوزیشن کیا ہے آج نہ اقبال ہوتا نہ اقبال کے یہ قلب ودماغ میں چمک پیدا کردینے والے حقائق اور روح میں برق تپاں بن کر دوڑ جانے والے شعر۔ ہاں تو اس بدر کی لڑائی میں، جب کہ تین سو بارہ۔ بظاہر بے کس وبے بس مسلمانوں کا مقابلہ قوت اور سامان کے ہجوم کے ساتھ تھا، مومنین کے دست وبازو خدا کے ہاتھ بنے۔ فرمایا کہ:۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ ۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ	تم نے ان دشمنوں کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے
وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ ۸/۱۷	تم نے تیر اندازی نہیں کی۔ بلکہ وہ تو اللہ نے کی ہے تلواریں تمہاری تھیں اور اُن میں بجلیاں ہمارے غضب کی کوندرہی

تھیں۔ تیر تمہارے تھے اور ان کی انیوں کے ساتھ تقدیریں
ہماری لپٹ رہی تھیں +

یہ تھے وہ دست و بازو جن کے متعلق فرمایا کہ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا | نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لیکن برعکس یقین کے جو شخص مغلوب گمان رہتا ہے۔ جو ایمان محکم کی بجائے تذبذب و وساوس میں اُلجھا رہتا ہے اس کی تمام محنتیں اکارت جاتی ہیں۔ تمام کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ تمام ساز و سامان، تمام جیوش و عساکر دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گولی چلانے والا اپنا کارتوس بھی ضائع کر دیتا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۚ

جس نے ایمان و یقین سے انکار کیا تو اُس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے +

لیکن جب اس میں ایمان پیدا ہو جائے تو پھر انہی بازوؤں کی پرواز حدود فراموش اور انہی ہاتھوں کی قوتیں وسعت ناآشنا ہو جاتی ہیں +

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا | تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

قرآن کریم میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ :-

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۚ ۲۴

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہدیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس یقین پر جم کر کھڑے ہو گئے تو ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ (جو انہیں بشارت دیتے ہیں کہ) مت ڈرو۔ بالکل نہ گھبراؤ۔ تمہارے لئے خوش خبری ہے اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے +

جب انسان میں ایمان و یقین کی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ وہ ہر ایک شے کو ایک نئے انداز سے دیکھتا ہے اس کی آنکھ پر کسی خارجی اثر کا رنگین چشمہ نہیں ہوتا۔ گویا وہ ہر چیز کو

اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہاں پہونچکر حضرت علامہ فرماتے ہیں ؎

میان آب و گل خلوت گزیدم — زافلاطون و فارابی بریدم

نکردم از کسے دریوزہ چشم — جہاں را جز بچشم خود ندیدم

قرآن کریم نے علم کی جو تعریف کی ہے وہ یہی ہے کہ علم اپنے سمع، ابصار اور قلب کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ۔ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔

جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو۔ اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو سمع بصر اور قلب ہر ایک کی بابت پرسش ہوگی۔

پوچھا جائے گا کہ جس چیز کو تم نے بطور علم کے تسلیم کیا تھا اسے تم نے سماعت و بصارت کی رو سے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے پرکھ کر دیکھ لیا تھا کہ واقعی یقینی شے ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمہارے قلب سلیم کو بھی اپیل کرتا تھا۔ اس کے برعکس اِن ذرائع سے کام نہ لینے والے کو قرآن کریم نے جہنمی قرار دیا ہے، وہ لوگ کہ جو :-

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔

دل و دماغ رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ تو بالکل ڈھور ڈنگر ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے انسے بھی زیادہ بے راہ رو[1]

بیکن نے علم کے متعلق یہی نظریۂ استقرار پیش کیا اور یورپ کی کایا پلٹ دی۔ اور قرآن کریم نے چودہ سو برس بیشتر علم کی یہی تعریف بیان فرمائی۔ لیکن قرون اولےٰ کے بعد مسلمانوں نے اسے غلاف اُڑھا کر اونچے اونچے طاقوں میں نہایت ادب و تعظیم سے رکھ چھوڑا اور خود اندھوں کی طرح دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلتے گئے کہ وہ گڑھے میں گرے تو یہ بھی ساتھ ہی جا ئیں۔

ہاں تو حضرت علامہ علم کی اسی قرآنی تعریف کے متعلق فرماتے ہیں کہ "جہاں را جز بچشم خود ندیدم۔

---

[1] اسلام کو عقل و بصیرت کے خلاف کہنے والے زیادہ نہیں تو انہی دو ایک آیات پر غور فرمائیں اور دیکھیں کہ ایسا مذہب کبھی علم و بصیرت کے خلاف ہوسکتا ہے!

اسی "چشمِ خود" کے متعلق ضربِ کلیم میں ہے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے — افلاک منور ہوں تیرے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیری شرر سے — ظاہر تیری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تیری موج گہر سے — شرمندہ ہو فطرت تیرے اعجاز ہنر سے

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

یہ ہے جہان کو اپنی نظر سے دیکھنا یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ آپ کی دنیا میں کیسا تحیر انگیز انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ نگہ کے بدل جانے سے ہر شے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں بدل جاتی ہیں۔ اور قرآن کریم کے الفاظ میں یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ۔ یہ زمین بدل جاتی ہے یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بخود نگر اگلہ ہائے جہاں چہ می گوئی — اگر نگاہِ تو دیگر شود جہاں دگر است

جاوید نامہ میں ہے۔

ایکہ منزل را نمی دانی زرہ — قیمت ہر شے ز اندازِ نگہ
نوع دیگر ہیں۔ جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

یہی وہ نگاہیں ہیں جن سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں اور یہی وہ نگاہیں ہیں جو بدبختی سے ہماری قوم کے نوجوانوں سے چھن چکی ہیں۔ جسے وہ بزعم خویش اپنی نگاہیں سمجھتے ہیں۔ اور وہ اپنی نہیں ہوتیں دوسروں کی مستعار ہوتی ہیں۔ یہی وہ متاعِ گراں بہا ہے جس کے چھن جانے پر ہر رونے والی آنکھ روتی ہے۔ اور ہر تڑپنے والا دل تڑپتا ہے۔ یہی نوجوانوں کی "بے بصری" اقبال کو بھی رُلاتی ہے اور اس نے اپنے قلب و دماغ کے بہترین جوہر اسی جہاد میں صرف کر ڈالے ہیں کہ کہیں سے یہ فردوسِ گم گشتہ پھر نوجوانوں کو مل جائے لیکن مومن کی "یہ چشمِ خویش" یہ اپنی آنکھ۔ اس وقت اپنی بنتی ہے۔ جب یہ قرآن کی روشنی میں اس آنکھ سے کام لے۔ کہ جس طرح آنکھ، باہر کے نور، بیرونی روشنی کے بغیر بیکار رہے۔ دیدۂ عقل قرآن کریم کے

نورمبین کے بغیر بالکل کور ہے۔ اسی کے متعلق نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ خدا کا نور قرآن کریم ہے۔ ایک مردِ مومن دنیا کی ہر شے کو قرآن کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اس کے افکار و آرا اس کے تابع چلتے ہیں۔ اس کا علم و فلسفہ اس کی پیروی کرتا ہے یہ ہے فرق ایک مومن اور غیر مومن حکیم میں۔ غیر مومن یا تو تنہا اپنی عقل کے زور پر چلتا ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے یا دوسرے انسانوں کے پیچھے پیچھے قدم بقدم چلتا ہے کہ اگر وہ جہنم کا راستہ اختیار کئے ہی تو یہ بھی وہیں پہونچے گا برعکس اس کے ایک حکیم مومن اپنی عقل و خرد سے قرآن کریم کی روشنی میں کام لیتا ہے اور چونکہ وہ روشنی خدائے علیم و خبیر کی عطا فرمودہ ہے۔ اس لئے وہ اشیاء کی حقیقتوں کو بے نقاب کردیتی ہے اور انسان کہیں پھر ہیں لغزش نہیں کھاتا۔ یہ ہے وہ حصہ الّا جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے اور جس سے محروم رہنے کی وجہ سے آج دنیا جہنم زار بن رہی ہے۔ اور یہ حصہ الّا یہ خدا کے غیر متبدل قوانین۔ یہ فطرت کے اٹل حقائق۔ سوائے قران کریم کے دنیا میں آج اور کہیں نہیں ہیں۔ چونکہ حضرت علامہ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم انسان کو کس قسم کی بصیرت عطا کرتا ہے۔ یہ نگاہوں کو کس اوج تک پہونچا دیتا ہے۔ یہ قلب انسانی میں کیا کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کس طرح اس کی ساری دُنیا بدل دیتا ہے۔ اس لئے جہاں کہیں وہ قرآن کریم کا ذکر تے ہیں تو وجدِ مسرت سے جھُوم اُٹھتے ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے قرآن کریم سے عشق و محبت کی چاشنی ٹپکتی ہے۔ وہ خود بھی اس میں جذب ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی جذب کر لیتے ہیں۔ رموز میں فرماتے ہیں :۔

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ‏ زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست
آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم ‏ حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرار تکوینِ حیات ‏ بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے تبدیل نے ‏ آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوع انساں را پیام آخریں ‏ حاملِ او رحمۃً للعالمیں

پھر اور سُنیئے :۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ‏ ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں مسلماناں اگر داری نظر ‌ ‌ در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست ‌ ‌ عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست ‌ ‌ ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش ‌ ‌ می دھد قرآں جہانے دیگرش

دو چیزیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو "ضمیرِ خویش" اور دوسرے "عصرہا پیچیدہ در انات اوست" اس عصرہا پیچیدہ کی خوبصورتی دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے۔ قرآن کریم کی آیات کو کھولتے جائیے۔ جہاں اندر جہاں۔ زمانہ در زمانہ ان کے اندر لپٹا ہوا ملے گا۔ قرآن کتاب فطرت ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانہ میں بھی جا کر یہ کہدے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآن بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا۔ جو کچھ میرے اندر تھا سب باہر آچکا۔ اب میں خالی برتن ہوں اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو قطعاً نہیں۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی۔ حضرت آدم کے وقت میں لوگ اتنا ہی جانتے ہوں گے کہ اس سے پیاس بجھائی جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا بھی جاتا ہے۔ لیکن اس پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیتیں زمانہ کی عقل و علم، تجربہ و مشاہدہ، وسعت و بلندی کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں جیسے وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج دیکھئے اس پانی سے کس قدر کام لئے جا رہے ہیں۔ کیا حضرت آدم کے وقت کے پانی میں یہ خصائص موجود نہ تھے! یا کیا دنیا آج یہ کہہ سکتی ہے کہ پانی میں جو کچھ تھا سب معلوم کر لیا گیا ہے، دنیا اپنے تجربات کی جن بلندیوں تک چاہے اُڑتی چلی جائے فطرت کی اشیاء ان کا ساتھ دیتی جائیں گی اسی فضا کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی۔ آج اس میں ایتھر کی امواج نے کیا کچھ کر دکھایا ہے۔ کیا ایتھر پہلے موجود نہ تھا! کیوں نہ تھا۔ اسی خلا میں لپٹا ہوا تھا، پیچیدہ تھا۔ یہی قرآن کریم کی کیفیت ہے۔ زمانہ علم و عقل کی جن پنہائیوں تک چاہے بلند ہوتا چلا جائے۔ قرآن اس سے بھی آگے نظر آئے گا۔ جو بات آج سمجھ میں نہیں آسکتی اسے کل کی آنے والی نسلیں جو اگر تجربات و مشاہدات میں موجودہ نسل سے آگے ہوں گی خود بخود سمجھ جائیں گی۔ اسی طرح قرآن کی ایک ایک آیت حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتی جائے گی اس وقت آپ کی کوئی آیت متشابہ نہیں رہے گی۔ سب محکم ہو جائیں گی۔ یہ میں نہیں کہتا۔ خود قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۴۱/۵۳

ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں اس نظامِ کائنات میں اور خود نفسِ انسانی کے اندر دکھاتے جائیں گے یہاں تک کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن فی الواقعہ حق ہے +

باقی رہا "در ضمیرِ خویش" خود نفسِ انسانی کے اندر کی نشانیاں، سو اس کے متعلق دُنیا ابھی بہت پیچھے ہے، ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا کہ وی آنا کے مشہور ڈاکٹر فرائڈ نے علمِ تجزیۂ نفس PSYCHO-ANALYSIS کے متعلق مشاہدات سے علم النفس کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور اس کے رفقائے کار ایڈلر اور ژنگ نے اس پر مزید اضافوں سے نفسِ انسانی کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں یہ نظریے ہنوز اپنے عہدِ طفولیت ہی میں ہیں۔ ذرا پختگی کی حد تک پہونچ جائیں تو پھر دیکھئے کہ قرآن کریم نے نفسِ انسانی کے متعلق جو کچھ بیان کر رکھا ہے وہ کس طرح حرف حرف سمجھ میں آجاتا ہے۔ دُنیا کو ذرا آگے تو بڑھنے دیجئے پھر دیکھئے کہ قرآن کریم اُسے کہاں لے جاتا ہے۔ کہ عصرہا پیچیدہ در آنات اوست +

(باقی دارد)

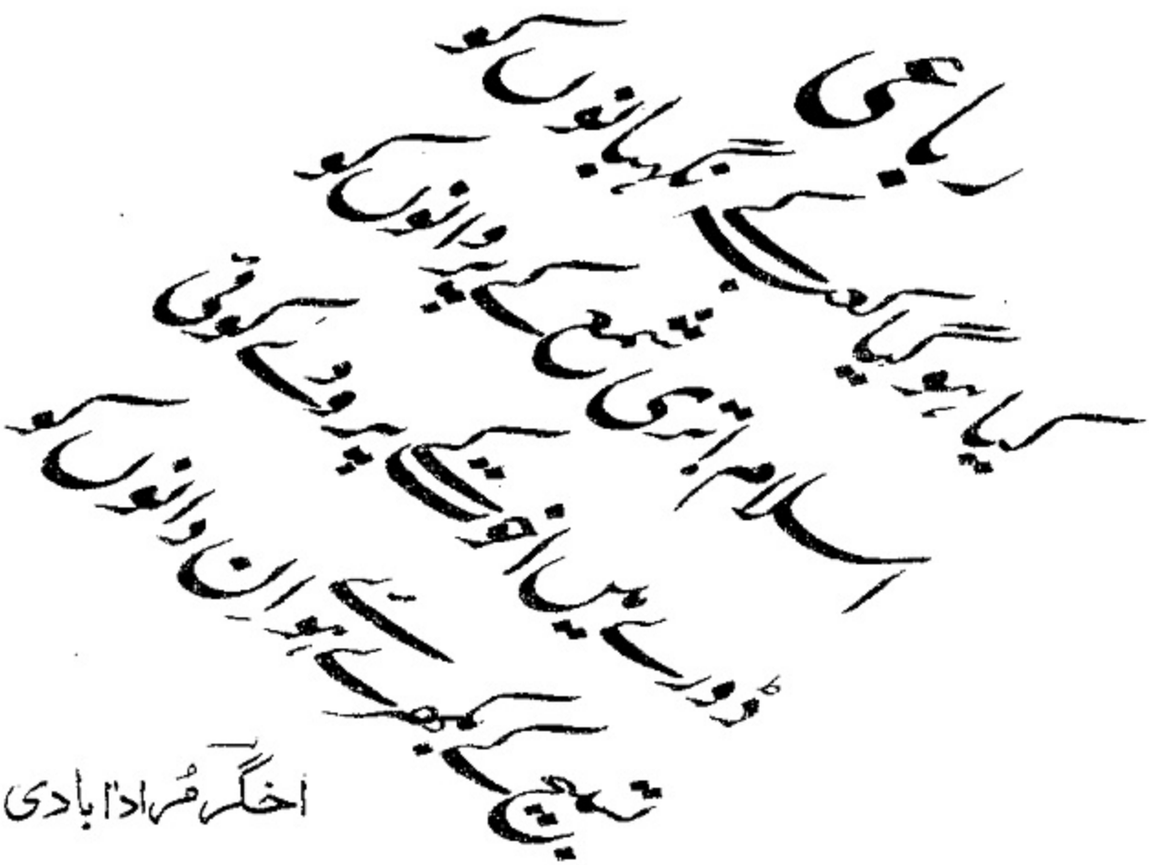

اخگر مرادآبادی

خطاب مسلم لیگ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ نے عنوان بالا کے ماتحت ایک

بیان ارکان مسلم لیگ کے نام ارسال فرمایا تھا جو پٹنہ کے اجلاس میں پڑھا گیا ہم

اس پیام کا حسب ذیل اقتباس بکمال فخر و مسرت طلوع اسلام میں شائع کرتے ہیں　　(ادارہ)

امّا بعد۔ فقد قال اللہ تعالیٰ ولقد سبقت کلمتنا بعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون وانا جندنا لھم الغالبون ⁘

حضرات! اس وقت مسلمانان ہندوستان جس دور سے گذر رہے ہیں اور جن مشکلات کا ان کو سامنا ہو رہا ہے۔ باخبر طبقہ اس سے بخوبی واقف ہے اور خدا کا شکر ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کے احساسات اس وقت بیدار ہو چکے ہیں۔ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی فہم و فراست کے موافق مدبران لیگ نے کچھ اسباب بھی اختیار کئے ہیں۔ اور مقام مسرت ہے کہ وہ ان اسباب میں کامیاب بھی ہو رہے ہیں۔ جو اس کی دلیل ہے کہ ان کا پہلا قدم صحیح راستہ پر پڑا ہے۔ غلط راستہ پر نہیں چلا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا پہلا قدم اتفاقاً صحیح راستہ پر پڑ گیا ہے یا آپ نے قرآن کریم اور سنّت نبویہ کی روشنی میں اس کو اختیار کیا ہے۔ بہر حال جو صورت بھی ہو اس کے لئے آپ مستحق صد مبارکباد ہیں ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف　　گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

پہلا قدم مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم | آپ کا یہ پہلا قدم مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم ہے جس کی سخت ضرورت تھی اور اسکی ضرورت سے کسی عاقل کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عقلاً و نقلاً یہ مسئلہ اپنی جگہ پر ثابت ہو چکا ہے کہ جو قوم اپنی مستقل تنظیم نہ رکھتی ہو وہ دنیا میں باقی نہیں رہ سکتی، بلکہ دوسری اقوام میں منضم اور منجذب ہو کر کالعدم ہو جاتی ہے۔

اور اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کی مستقل تنظیم کی صورت یہی ہے کہ تمام مسلمان اسلامی جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں۔ کیونکہ غیر اسلامی جھنڈے کے نیچے صرف مشترک تنظیم ہو سکتی ہے مسلمانوں کی مستقل تنظیم نہیں ہو سکتی اور مشترک تنظیم کا نفع ہمیشہ اکثریت کو پہونچتا ہے۔ اقلیت کو اس سے کچھ نفع نہیں ہو سکتا اگر وہ اپنی مستقل تنظیم سے محروم ہو

پس مدبّران مسلم لیگ نے بڑی دانش مندی سے کام لیا کہ مسلمانوں کی جُداگانہ تنظیم کا اہتمام کیا کہ اسکے بعد ہی مشترک تنظیم سے ان کو نفع ہو سکتا ہے۔ ورنہ ہمیشہ دوسروں کے حاشیہ بردار ہو کر اُن کے رحم و کرم پر رہ جاتے اور کچھ دنوں کے بعد ان کی ہستی فنا ہو جاتی۔

یہی وہ چیز ہے جسکی طرف آیت کریمہ میں لفظ جند نا سے اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ جند لشکر کو کہتے ہیں اور لشکر اجتماعی شان سے بنتا ہے۔ انفرادی حالت میں کسی قوم کی خواہ وہ کتنی ہی شمار رکھتی ہو لشکر نہیں کہا جا سکتا اور اللہ کا لشکر وہی ہو سکتا ہے جو اللہ کے نام پر منظم ہوا ہو، وطن پرستی یا قوم پرستی کے نام پر منظم نہ ہوا ہو۔

یہ پہلا قدم تھا جو مسلم لیگ نے صحیح اُٹھایا۔ اس کے بعد ایک قدم آگے بڑھنے کی اور ضرورت ہے جس کے بعد کامیابی اور غلبہ کا سہرا آپ کے سر ہوگا۔ خدا کرے آپ کا یہ دوسرا قدم صحیح راستہ پر ہو۔ اگر آپ نے قرآن کریم کی ہدایات اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھا اور اسی کو مشعل راہ بنایا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دوسرے قدم میں غلطی سے دوچار ہوں۔ مسلمانوں کو کسی کے اتباع یا تقلید کی ضرورت نہیں۔ اُن کے گھر میں وہ سب دولتیں جمع ہیں جن کو فلاح اور کامیابی میں دخل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بعض مسلمان دوسری قوموں کی تقلید کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن کریم اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کر کے ترقی کرنا نہیں چاہتے، حالانکہ دوسری قوموں کے ذرائع ترقی سے کفار کو اور کفر ہی کو ترقی ہو سکتی ہے مسلمانوں کو اور اسلام کو ترقی نہیں ہو سکتی، اگر مسلمان مسلمان رہ کر اسلامی ترقی چاہتے ہیں تو ان کو اپنے ماضی کی طرف لوٹنا چاہیئے اور قرآن کریم اور اسوۂ نبویہ کو مشعل راہ بنانا چاہیئے۔ سنئے اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ۔ یقیناً ہمارا ہی لشکر ہمیشہ غالب ہوتا ہے۔ یہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے اور نہایت مستحکم وعدہ ہے جو کبھی خلاف نہیں ہو سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کا لشکر ہمیشہ غالب ہی رہا ہے۔ وہ کسی سے کبھی مغلوب نہیں ہوا اور اگر کبھی اس کے خلاف ہوا ہے تو اس کا سبب صرف یہی تھا کہ اس لشکر کے خدائی لشکر ہونے میں کچھ کسر تھی۔

دوسرا قدم یہ ہے کہ مسلم لیگ خدا کا لشکر بن جائے پس مسلم لیگ کو دوسرا قدم اس طرح اُٹھانا چاہیئے کہ اس لشکر کو جسے اس نے اللہ کے نام پر منظم کیا ہے صحیح معنے میں اللہ کا لشکر بنا دے، اسکے بعد یقیناً وہی کامیابی

غالب اور وہی فتح مند ہوگی اور اسکے سر کامیابی کا سہرا ہوگا۔ حضرات آپنے ترقی کے بہت سے اسباب سُنے ہوں گے، بہت ذرائع سوچے ہوں گے۔ بہت سے راستے اختیار کئے ہوں گے۔ ذرا اس راستہ کو بھی آزما لیجئے جس کا تجربہ آپ کے اسلاف نے ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک کیا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ جب تک وہ اس راستہ پر قائم رہے، ہمیشہ غالب اور کامیاب رہے اور جس دن اس راہ سے ہٹے اسی وقت سے زوال اور پستی انکے سامنے آنے لگی۔ یہاں تک کہ نوبت اس حال کو پہونچ گئی جو ہمارے اور آپ کے سامنے ہے۔ تو کیا اب بھی ہمکو اپنی ماضی کی طرف لوٹنے میں کسی دوسری حالت کا انتظار ہے۔ لِلّٰہ اپنے حال پر رحم کیجئے اور اس سے زیادہ اپنے کو تختۂ مشق نہ بنائیے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ" +

یومِ اقبال ۱۹۳۹ء

انٹر کالجیئیٹ مسلم برادرہڈ (لاہور) کے جواں سال، جواں بخت، جواں ہمت ارکان نے گذشتہ سال یومِ اقبال منا کر جس عظیم الشان اسلامی یادگار کی بنیاد رکھی ہے اس پر ملتِ اسلامیہ جسقدر فخر کرے بجا ہے۔ ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کا "یومِ اقبال" اس اعتبار سے عدیم النظیر تھا کہ وہ حضرت علامہؒ کی زندگی میں پہلا اور آخری "یومِ اقبال" تھا۔ اس سال برادرہڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۲ر فروری کو یہ عظیم المرتبت تقریب منائی جائے۔ امسال یہ تقریب اسلئے زیادہ اہم ہے کہ حضرت علامہؒ کی وفات کے بعد یہ پہلا یومِ اقبال ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ تقریب سال گذشتہ سے بھی زیادہ جذب واثر اور عظمت و شوکت کے ساتھ تمام ہندوستان میں منائی جائیگی۔ اس ضمن میں ہمارا مشورہ ہے کہ برادرہڈ بجائے "اقبال ڈے" کے "اقبال ویک" کا اعلان کرے تاکہ مختلف مقامات پر ایک ہفتہ کے مختلف دنوں میں جلسے منعقد ہوسکیں اور لاہور کا مرکزی اجتماع اس ہفتہ کی کسی تعطیل کے دن رکھا جائے۔ اسلامی اخبارات کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اس تقریب سے متعلق جملہ تفصیلات کے مشتہر کرنے میں ان نوجوان طالب علموں کو مدد دیں۔ مقالہ نگار اور شعرا حضرات اپنے مضامین اور کلام سے انکی اعانت کریں اور صاحب ثروت حضرات مالی امداد سے اس سعادت میں شریک ہوں۔ سال گذشتہ ہمیں یہ معلوم کرکے دلی رنج ہوا کہ "بزرگانِ ملت" میں سے بہت کم حضرات نے ان نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی اور اس تقریب کو اس قدر وسیع پیمانہ پر منانے کا سارا بوجھ ان نوجوانوں نے اپنے ہی کندھوں پر اُٹھایا۔ اُمید ہے ان بزرگوں کی طرف سے امسال تلافی مافات کا ثبوت ملیگا۔

ہم ان سعادتمند نوجوانوں کو ان کے اس مستحسن اقدام پر مستحق تبریک تہنیت سمجھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے نیک ارادوں میں برکات عطا فرمائے۔ طلوعِ اسلام اس باب میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہے۔ اس ضمن میں خط و کتابت:-

سکریٹری انٹر کالجیئیٹ مسلم برادرہڈ۔ مسجد شاہ چراغ بلڈنگس۔ مال روڈ۔ لاہور، سے کی جائے +

اسبابِ زوالِ اُمّت

جناب مولانا محمد اسلم صاحب جیراج پوری

اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ حیرت انگیز امر مسلمانوں کا زوال ہے۔ کیونکہ وہ ایسی سچی اور روشن کتاب کے حامل ہیں جو اُن کو نہ صرف آخرت بلکہ دنیا میں بھی ہر قسم کی عزت اور بلندی بخشنے کا اعلان کرتی ہے۔

قرآن کا وعدہ حق ہے کہ مومنوں کے لئے امن ہے۔

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اُولٰئک لھم الامن وھم مھتدون۔ ۶/۸۲

جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو اُنہوں نے ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔ ان کیلئے امن ہے اور وہ ہدایت پر ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ عزت مومنوں کے لئے ہے۔

ان العزۃ للہ ولرسولہ وللمومنین۔ ۶۳/۸

حقیقت یہ ہے کہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومنوں کی مدد اللہ کے ذمہ ہے اور وہی سربلند رہیں گے۔

وکان حقا علینا نصر المومنین۔ ۳۰/۴۷

اور ہمارے اوپر ہے حق مومنوں کی مدد کا۔

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ ۳/۱۳۹

اور نہ سست بنو اور نہ غم کرو حال یہ ہے کہ تمہیں سربلند ہوگے اگر تم مومن ہو۔

قرآن یہ بھی اطمینان دلاتا ہے کہ کفار کو مومنوں پر کبھی غلبہ نہ ہوگا۔

ولن یجعل اللہ للکٰفرین علی المومنین سبیلا۔ ۴/۱۴۱

اور اللہ کافروں کو کبھی مسلمانوں کے اوپر راستہ نہ دے گا۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومن کفار پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔

ولو قاتلکم الذین کفروا لولوا الادبار ثم لا یجدون ولیا ولا نصیرا ۴۸/۲۲

اور جو کفار تم سے لڑیں گے تو وہ نہ کوئی پشت و پناہ پائیں گے نہ کوئی مددگار۔

اور قرآن مومنوں کے لئے رُوئے زمین کی بادشاہت کا بھی وعدہ کرتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ ۵۵/۲۴

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اُنہوں نے عمل صالح کئے کہ ان کو ضرور روئے زمین کا بادشاہ بنائیگا

لیکن ان کے برخلاف صدیوں سے مسلمان ایک مسلسل زوال اور انحطاط کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں جو سرعت کے ساتھ ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اقوام عالم سے پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ ان کا بڑا حصہ کفر و شرک سے مغلوب ہو کر محکومیت کے دردناک عذاب میں گرفتار ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے۔ اور ممکن نہیں ہے کہ مومن ہوتے ہوئے ہمارے ساتھ اللہ اپنے وعدے پورے نہ کرتا۔ اس لئے کچھ خرابیاں ہمارے ہی ایمان و عمل میں ہیں جن کی وجہ سے ہم ان کے مستحق نہ رہ سکے۔

ہمارے اسباب زوال دو قسم کے ہیں ایک خارجی جو غیر مسلم اقوام کے حرب و ضرب و تغلب و تسلط سے پیدا ہوئے۔ دوسرے داخلی جو خود ہماری بے راہ روی اور سیاسی غلطیوں کی وجہ سے پیش آئے۔ میں انہیں داخلی اسباب سے بحث کروں گا۔ کیونکہ ملت کے امراض کے اصلی باعث یہی ہیں۔ انہیں کی بدولت ہم کمزور ہو گئے جس کی وجہ سے دوسروں نے جو توانا اور قوی تر تھے ہمارے اوپر اپنا تسلط جما لیا اگر ان اسباب کے دفعیہ کا سامان ہو جائے تو کمزوری خود بخود جاتی رہے گی۔

لہذا اصل نقطہ بحث وہی امور ہیں جنکے باعث ہم انعامات الٰہی کے مستحق نہ رہے اور کرم کی جو بارشیں ہمارے اسلاف پر ہوئی تھیں ان سے محروم کر دیئے گئے۔

اس لئے لازم ہے کہ آغاز عہد سے ان کے اوپر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو سکے۔

اسلامی تعلیم کی اصلی روح یہ ہے کہ انسانوں کا حاکم اکیلا اللہ ہے اور سب صرف اسی کے بندے ہیں۔ یہ عظیم الشان منتہائے نظر ہے جو قرآنی آیات میں جابجا واضح کیا گیا ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۱۲/۴۰

کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے اس نے حکم دیا ہے

کہ تم بجز اس کے کسی کے بندے نہ بنو۔

اسلام کی رو سے ایک انسان دوسرے انسان پر یعنے ایک بھائی دوسرے بھائی پر حکمراں نہیں ہو سکتا ان معنوں میں کہ اپنی منفعت کے لئے اپنی منشاء کے مطابق اس پر حکومت کرے۔ بلکہ اسلامی امارت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے احکام الٰہی کی تنفیذ کی جائے اور بس۔ اللہ کے سوا اسلام کسی کو حاکم نہیں تسلیم کرتا۔

خلافت راشدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں جس طریق پر اُمت کو چلایا اس کے متعلق کچھ لکھنا ہی غیر ضروری ہے۔ وہ تو خالص پیغمبرانہ تعلیم اور مربیانہ تربیت تھی جو عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ آپ کا ۲۳ سالہ عہد نبوت گویا ۲۳ موتیوں کی مالا ہے جو زمانہ کی گردن میں پڑی ہوئی ہے۔ آپؐ کی صحبت کے فیض سے صحابہ کرامؓ نے خلافت کو اُنہی اُصول پر قائم کیا۔ خلیفہ میں شاہانہ تمکنت اور جاہ و جلال حکومت کی کوئی شان نہ تھی۔ عام لوگوں کی طرح وہ بھی سڑکوں پر پیدل پھرتا تھا، نہ اس کے ساتھ محافظ ہوتے تھے نہ نقیب سب لوگ اس سے ملتے تھے اور سب سے وہ ملتا تھا۔ اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں بجز عہدۂ خلافت کے اور کوئی امتیاز نہ تھا نہ اس کو اس قسم کی دینی ریاست حاصل تھی کہ جو چاہے حکم دیدے وہی مذہبی مسئلہ ہو جائے بلکہ وہ صرف احکام دینی کو نافذ کرنے کا مجاز تھا۔

اس خلافت کا کل زمانہ تیس سال رہا اس تیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کو وہ سربلندی نصیب ہوئی کہ ترکستان سے بحر خزر تک اور افریقہ میں تونس تک اسلام پھیل گیا اور قوت اس قدر زبردست ہو گئی کہ روئے زمین پر کسی کو ان سے ٹکرانے کا یارا نہ رہا۔ یہ تمام آسمانی برکتیں اور فتوحات اور اُمت اسلامیہ کی یہ عظمت و شان اس وجہ سے تھی کہ سب اسلامی نظام میں منسلک اور اکیلے اللہ کے فرماں بردار تھے۔ خلیفہ کی ذات میں اُنکی مرکزیت تھی جس کی وجہ سے ان کے ملی مقاصد متعین تھے۔ اور ساری اُمت ایک محور پر گھومتی تھی۔

عہد بنی اُمیہ خلافت راشدہ کے بعد بنی اُمیہ کا دور آیا۔ جو اس دن سے شروع ہوا جس دن امیر معاویہ کی خلافت پر عام بیعت ہوئی۔ یعنے سنہ ۴۱ھ سے اس دور میں بھی جو ۹۲ سال رہا۔ امت ایک ہی جھنڈے کے نیچے رہی

ان خلفاء کی ذات میں بھی اُمت کی مرکزیت قائم تھی، اور خواہ وہ کیسے ہی رہے ہوں۔ اسلامی قوت اور شوکت کو اُنہوں نے سنبھالے رکھا۔ بلکہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں تو فتوحات کے حدود مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک اور مغرب میں اُندلس تک پہونچ گئے تھے اور بڑی فوجوں کے علاوہ ایک طاقتور بحری بیڑہ بھی تھا جس نے سطح آب پر کئی بار رومیوں کو شکستیں دیں تھیں۔ دولت کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں اہل نصاب راتوں کو اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر گھومتے تھے۔ مگر کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔

استبداد مگر باوجود ان خوبیوں کے مرض پیدا ہو چکا تھا۔ یعنے استبداد، وہ استبداد جو اقوام و امم کے لئے ہمیشہ مہلک ثابت ہوا ہے۔ اس کا پہلا مظہر خود ان کی خلافت تھی۔ خلفائے راشدین میں سے اگرچہ ہر ایک کی نوعیت انتخاب جُداگانہ تھی مگر مشورہ اور بیعت عامّہ یعنے جمہوریت کی روح ہر ایک میں موجود تھی۔ لیکن امیر معاویہؓ جو خلافت بنی اُمیّہ کے بانی ہیں ان کا انتخاب عام نہیں ہوا تھا۔ صرف اہل شام نے اُن کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور اہل عراق نے امام حسنؑ کو منتخب کیا تھا۔ مگر جب امیر معاویہ نے اُن پر لشکر کشی کی تو اُنہوں نے اُمت میں خونریزی کو ناپسند کر کے مصالحت کر لی۔ لہٰذا اہل عراق نے بھی امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مگر مغلوب ہو کر۔ اس وجہ سے ان کی خلافت میں تغلّب شامل تھا۔ چنانچہ جب حضرت سعدؓ بن وقاص فاتح قادسیہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، امیر معاویہؓ کے پاس آئے تو ان کو اس طرح سلام کیا جس طرح بادشاہوں کو کیا جاتا ہے۔ امیر معاویہ ہنسے اور کہا کہ اگر تم مجھے امیر المومنین کہتے تو کیا بگڑ جاتا۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ جس طریق سے تم نے خلافت حاصل کی ہے اگر مجھے ملتی تو میں کبھی اُس کو قبول نہ کرتا۔

غرض اہل نظر اور ارباب صلح خلافت کو اُسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے جو خلفائے راشدینؓ کے عہد میں تھا۔ امیر معاویہ کا غلبہ اور تسلّط سے اس کو حاصل کرنا ان کو پسند نہ تھا۔ اگرچہ بعد میں یہ تغلّب رضامندی سے بدل گیا۔ کیونکہ امیر معاویہ کی خلافت کی قابلیت میں کسی شخص کو بھی اختلاف نہ تھا لیکن اُنہوں نے خلیفہ کے انتخاب عام کے دستور ہی کو توڑ ڈالا۔ اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کیا جس کے بعد سے خلفائے بنی اُمیّہ سلسلہ وار اپنے ہی خاندان کے افراد میں سے جس کو چاہتے تھے ولی عہد بناتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنکی

خلافت پر استبداد کا رنگ غالب رہا۔ اور انکی حکومت خاندانی سلطنت ہوگئی۔ مگر چونکہ خلیفہ کا لفظ دینی اقتدار اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا اس لئے اُنہوں نے اس لقب کو ترک نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ وہ لوگوں پر اپنا مذہبی اثر قائم رکھتے تھے۔ بے شک بنی اُمیہ کی حکومت میں حضرت عمر بن عبد العزیز کا عہد مستثنیٰ ہے۔ جنہوں نے اُن کے مظالم کو مٹا کر خلافت راشدہ کی شان قائم کر دی تھی۔ مگر اُن کا کل زمانہ صرف دو سال پانچ ماہ تھا۔

قہر و غلبہ | بنی امیہ کے عہد میں قہر و غلبہ کی حکمرانی تھی۔ یہانتک کہ عبد الملک نے جو ان کا چوتھا اور سب سے مدبّر خلیفہ تھا صاف صاف کہدیا کہ "تم لوگ کیوں کر یہ خواہش رکھتے ہو کہ ہم شیخین رضؓ کے طریقہ سے تمہارے اوپر حکومت کریں۔ پہلے خود تو ویسے بنو جیسے اُن کے زمانہ کے لوگ تھے"۔ اس وجہ سے اُنکی حکومت میں وہ مظالم ہونے لگے جو اس استبداد میں لازمی ہیں۔ لوگ سختی کے ساتھ دبائے جانے لگے جس کی طرف سے مخالفت ہوتی اس کا سر کٹوا کر مشتہر کیا جاتا تاکہ دوسرے لوگ ڈر جائیں اور مخالفت کا خیال بھی دلمیں نہ لائیں۔

خلفاء کے علاوہ اُن کے بعض بعض عمّال نے بھی آزاد طبع اور حریت پسند مسلمانوں کو جنہوں نے خلافت راشدہ کا عہد دیکھا تھا نہایت سختی کے ساتھ محکوم اور رعایا بنانا شروع کیا۔ زیاد اور اس کے بیٹے ابن زیاد کے مظالم مشہور ہیں۔ یہ صرف شُبہ پر لوگوں کو گرفتار کر کے سخت سے سخت سزائیں دیتے تھے۔ حجاز بن یوسف کوفہ کے عامل نے جس قدر آدمیوں کو قتل کیا مسعودی کے بیان کے مطابق انکی تعداد سوا لاکھ سے کم نہ تھی۔

تفریقِ اُمّت | استبداد کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ انکی حکومت رعایا کے فائدہ کے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ حکمران جماعت کے مقاصد کے لئے ہوتی ہے۔ یہ خلفاء اپنے مخصوص اغراض کے لئے ملّت میں وحدت قائم رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ جاہلانہ عصبیتوں کو اُبھار کر ان کو ایک دوسرے کا دشمن رکھتے تھے۔ تاکہ ضرورت پر ایک فریق سے دوسرے فریق کے مقابلہ میں کام لے سکیں۔ ان باہمی عداوتوں کی وجہ سے خود خلفاء کو بھی خطرہ رہتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے ساتھ محافظ دستے رکھتے تھے۔ یہانتک کہ مسجدوں

میں بھی ان کے لئے مقصورے بنائے جاتے تھے اور جب وہ نماز پڑھتے تھے تو دائیں بائیں دونوں طرف مسلح سپاہی حفاظت کے لئے کھڑے رہتے تھے۔ حالانکہ خلفاء راشدینؓ عام لوگوں کی طرح بازاروں میں پھرتے تھے۔ اور سب کے ساتھ مسجدوں میں جاتے تھے اور خود نماز پڑھاتے تھے۔

بیت المال | سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خلفاء راشدین عام افراد ملت کی طرح بسر کرتے تھے۔ بیت المال کو مسلمانوں کی ملکیت سمجھتے تھے اور خود اپنے مال سے زیادہ اسکی حفاظت کرتے تھے۔ اس میں سے سوائے اس کے جو ان کے گذارہ کے لئے مقرر کر دیا جائے اپنی ذات کے واسطے ایک حبہ بھی نہیں لیتے تھے۔ اس پر بھی کہا کرتے تھے کہ خلافت کی ذمہ داریوں سے قیامت کے دن اگر ہم بلا عذاب اور ثواب کے نکل گئے تو بہت بڑی کامیابی ہے لیکن خلفائے بنی اُمیہ شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے۔ بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے۔ اور جس طرح چاہتے تھے اپنی منشا کے مطابق اس کو صرف کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جس کا اقتدار خزانہ پر ہوگا وہی ملک کے لوگوں پر اپنا اثر قائم کر سکتا ہے۔ یہ خلفاء مسلمانوں کے بیت المال کو اپنے استبدادی اغراض پر صرف کر کے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرتے تھے۔ کیونکہ جو لوگ اُن کے یہاں سے تنخواہیں پاتے تھے اُن میں یہ جرأت باقی نہیں رہتی تھی کہ مخالفت کر سکیں۔ جو نافرمانی پر آمادہ ہوتا اس کی تنخواہ بند کر دی جاتی۔ چنانچہ یزید کے عہد میں اہل حرمین کی اور ولید کے زمانہ میں آل حرم کی تنخواہیں بند کی گئیں۔ انصار کے وظائف بارہا اس بنا پر رد کئے گئے کہ اہل بیت کی طرفداری کرتے ہیں۔

مدینہ کا عامل زکوٰۃ کی رقم قریش کے اعیان کو قرض پر دیتا تھا جس کی وجہ سے ان پر اپنا قابو رکھتا تھا جہاں کوئی مخالفانہ حرکت ان سے نمایاں ہوتی فوراً قرض کا مطالبہ شروع ہو جاتا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بنی امیہ کی اطاعت پر مجبور ہو گئے

ہوس زر | خلافت راشدہ میں ممالک مفتوحہ سے محاصل اس لئے وصول کئے جاتے تھے کہ مجاہدین کی ضروریات رفع کی جائیں۔ لیکن بنی اُمیہ کا نصب العین چونکہ اپنے گھرانے میں ایک مستقل سلطنت قائم کرنا تھا اس لئے ان کو ضرورت ہوئی کہ طاقتور قبائل و اشخاص پر اپنا اثر رکھیں۔ اس کی صورت سوائے اس کے اور کیا تھی کہ اُنکے سامنے دولت پیش کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے بیت المال کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور جا و بیجا

بے دریغ اسکی رقمیں صرف کرنے لگے امراء و رؤسا، قبائل کے علاوہ خطباء و شعراء کو بھی بڑی بڑی رقمیں زبان بندی کے لئے دی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ محاصل کی وصولی میں ناجائز سختیاں بھی عمل میں آنے لگیں یہاں تک کہ بعض صوبوں میں ذمیوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی ان سے جزیہ وصول کیا جانے لگا۔ افریقہ اور خاص کر خراسان میں اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو اُنہوں نے یہ کہکر کہ ہم مبلغ ہیں محصل نہیں ہیں۔ اس خلاف اسلام طریقہ کو بند کیا جس کے بعد لاکھوں ترک حدود سمرقند میں جو اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے، پھر مسلمان ہو گئے

مال زکوٰۃ کو بھی جس کے مصارف خود قرآن کریم نے متعین کر دیئے ہیں۔ یہ خلفاء اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کرتے تھے یہ دیکھ کر عمال حکومت میں بھی دست درازی کی عادت ہو گئی۔ خلفاء بنی اُمیہ نے ایک حد تحصیل زر کی یہ بھی نکالی کہ عہدوں کو فروخت کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمال ان کو اپنی زر خرید جائداد سمجھ کر رشوت، غبن اور جبر ہر طریق سے دولت پیدا کرنے لگے، خلفاء جب ان سے خفا ہوتے تو ان کو برطرف کر کے ان کی جائدادیں ضبط کر لیتے۔

الغرض شخصی اور استبدادی حکومت کی جو لازمی خرابیاں ہیں وہ خلافت بنی امیہ میں پیدا ہو چکی تھیں۔ خلفاء بنی امیہ اگرچہ مسلمانوں کا مرکز تھے لیکن انکی مرکزیت خلفائے راشدین کی طرح اخوت، مساوات اور جمہوریت کی مرکزیت نہ تھی۔ بلکہ اُنہوں نے ملت اسلام کو جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں صرف اللہ کی غلام تھی اپنا غلام بنا لیا تھا۔

بنی عباس | بنی عباس جنہوں نے مخفی تبلیغوں سے بنی اُمیہ کی بغاوت کا بیج بویا اور پھر ان کے مقابلہ کے لئے لوگوں کو کھڑا کیا جب کامیاب ہو کر ۱۳۲ھ میں تخت خلافت پر آ گئے تو اُنہوں نے بھی وہی استبداد قائم رکھا جو بنی اُمیہ کے عہد میں تھا۔ ان میں سے ابتدائی آٹھ خلفاء کا زمانہ جو تقریباً سو برس رہا قوت اور شوکت کا زمانہ تھا اُنھوں نے شعائر اسلامی کا احترام رکھا، نمازیں بھی پڑھتے تھے۔ حج بھی کرتے تھے اور جہاد میں بھی حصہ لیتے تھے مگر باوجود اس کے ملک و ملت کو ہمیشہ کے لئے اپنا اور اپنی اولاد کا غلام رکھنا چاہتے تھے۔ ایک کے بجائے دو دو بلکہ تین تین ولی عہد مقرر کرتے تھے، اور ان عہد ناموں پر اللہ، رسولؐ اور ملائکہ سب کو گواہ بناتے

تھے تاکہ یہ "جائداد" کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ جاسکے اور ابد تک ساری ملت اسلامیہ انہیں کے استبداد کے شکنجوں میں رہے۔

خلفاء بنی اُمیہ کو تو جملہ اُمت کی مرکزیت بھی حاصل تھی۔ مگر بنی عباس کے قبضہ سے اندلس روزِ اول سے خارج رہا جہاں بنی اُمیہ کے بقایا میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن معاویہ نے پہونچ کر اپنی سلطنت قائم کرلی جو تھوڑے ہی دنوں کے بعد عظمت وشان کے لحاظ سے خلافت عباسیہ کی حریف ہوگئی۔ علاوہ بریں عہدِ بنی اُمیہ میں قوت کی حکمرانی تھی۔ کیونکہ ان کی سلطنت اپنی قوم عربوں کی عصبیت اور طاقت پر قائم تھی، مگر بنی عباس نے عجمیوں خاصکر خراسانیوں کی مدد سے سلطنت حاصل کی تھی اس وجہ سے کوئی قومی طاقت انکے پاس نہ تھی۔ ان کی خلافت بجز اسکے کہ خلیفہ عرب تھا اور زبان عربی تھی سرتاسر عجمی تھی اور ساری وزارتیں وامارتیں عجمی موالیوں کے ہاتھوں میں تھیں یہی وجہ ہوئی کہ بنی عباس کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں یہ خلافت کو ہمارے ہاتھوں سے نکال کر دوسروں کو نہ دے دیں۔ چنانچہ اُنہوں نے ایرانیوں کی طاقت کے بالمقابل ترکوں کی بھی ایک فوج مرتب کی تاکہ توازن قائم رکھیں۔ مگر اس ترکی فوج نے خود خلفاء پر تغلب حاصل کرلیا جس کو چاہتے تھے، خلیفہ بناتے تھے اور جس کو چاہتے تھے معزول بلکہ قتل کردیتے تھے۔ خلفاء کی اس بے بسی کے زمانہ میں نئی نئی اسلامی سلطنتیں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ جن کے غلبہ سے وہ بالکل بے دست وپا ہوگئے دیلمہ اور سلاجقہ کے تسلط کے عہد میں جو صدیوں رہا ان خلفاء کا صرف مذہبی اثر رہ گیا تھا اور حکومت سلاطین کے ہاتھوں میں تھی۔ یہانتک کہ ۲۹۵ھ میں افریقہ میں فاطمیہ نے اور اس کے بعد اندلس میں عبدالرحمن ناصر نے اپنی اپنی خلافتوں کا اعلان کردیا جس سے دنیائے اسلام میں بیک وقت تین خلافتیں قائم ہوگئیں جو ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ اور وہ مرکزیت جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوع انسانی کی صلاح وفلاح کے لئے نصب فرمایا تھا۔ ان قریشی خانوادوں کی باہمی رقابت اور دنیاوی منافست سے بازیچۂ طفلاں بن گئی۔

خلافت کا مقصد یہ تھا کہ جملہ بنی نوع انسان صرف حکومت الٰہی کے فرماں بردار ہوں نہ کہ انسانوں کے۔ لیکن خلفاء بنی اُمیہ وبنی عباس نے اس کو محض خاندانی سلطنت بنانے کی کوشش کی جس کا انجام

وہی ہوا جو ہر ایسے دنیاوی کارگاہ عمل کا ہوا کرتا ہے امراء ولایات نے جب خلفا کی یہ خودغرضی دیکھی تو ان میں بھی اسی قسم کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ یکے بعد دیگرے خود مختار ہوتے گئے۔ خلفا کا رسمًا صرف اس قدر اثر رہ گیا تھا کہ یہ متغلبین تحفے اور ہدیئے بھیج کر ان سے اپنی اپنی حکومتوں کے فرمان لکھوا لیتے تھے آخر ۶۵۶ھ میں یہ بے جان خلافت ہلاکوں کے ہاتھوں غارت ہوگئی۔

خلفاء عثمانیہ بغداد کی عباسی خلافت کی تباہی کے بعد سلاطین مصر نے انہیں بقایائے بنی عباس میں سے ایک شخص کو مصر میں خلیفہ بنا لیا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی حکومت کو مستحکم رکھیں۔ ان خلفاء کا عزل ونصب خود سلاطین مصر کے ہاتھوں میں تھا جن کے وظیفہ پر یہ گزر کرتے تھے۔ ۹۲۳ھ میں سلیم عثمانی نے مصر کو فتح کر کے خلافت بھی حاصل کر لی اور اس طرح اپنے دنیاوی وقار کے دستار میں دینی عزت کا بھی طرّہ لگایا۔ لیکن خلفاء عثمانیہ بالطبع اپنے رتبہ سلطنت ہی کو جس کے ذریعہ سے اُنہوں نے خلافت حاصل کی تھی بالاتر سمجھتے رہے اور سوائے سلطان کے کبھی اپنے آپ کو خلیفہ کہلانا پسند نہ کیا۔ علاوہ بریں انکی خلافت بھی خلافت عامّہ نہ تھی بلکہ ان کے رقبۂ مقبوضہ تک محدود تھی اور اُنہوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور جزیرۃ العرب کے محافظ ہونے کے جو فتح مصر کے بعد انکی سلطنت کا جزو ہو گیا تھا فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا۔ یہاں تک کہ حج جس میں اقصائے عالم کے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اور جو اجتماع ملت کا دینی مرکز ہے۔ اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے۔ بالآخر ۱۳۴۲ھ میں جمہوریہ ترکیہ نے اس خلافت کا بھی جو اتحاد ملّت کا ایک بوسیدہ رشتہ اور بے معنے ادارہ رہ گیا تھا الغا کر دیا جس کے بعد سے مسلمانوں کی مرکزی زندگی کا نام بھی جاتا رہا۔

موجودہ حالت آج امّت اسلامیہ کی تعداد تمام عالم میں تقریبًا ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی قوموں کی تعداد سے اگر زیادہ نہیں ہے تو کم بھی نہیں ہے۔ مگر ان میں سے سوائے ترک، ایرانی افغانی اور عرب کے جن کی مجموعی تعداد چھ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ بقیہ ساری اُمّت غیر مسلم حکومتوں کے قبضہ میں ہے یعنے مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا زیادہ سے زیادہ صرف دسواں حصہ ہے جو آزاد کہا جا سکتا ہے ان آزاد اقوام مسلمہ کا بھی کوئی ایک مرکز نہیں ہے۔ بلکہ متعدد خود مختار سلطنتوں میں یہ بٹی ہوئی ہیں۔

عرب جس سے اسلام کا چشمہ اُبلا تھا آج اس میں چھوٹی بڑی ۹ سلطنتیں ہیں جن میں سے کوئی کسی کے اثر میں ہے اور کوئی کسی کے۔ یہ سارا نتیجہ ہے امراء و سلاطین امت کی ان مطلق العنانیوں کا جن کی وجہ سے اُنہوں نے مرکزیت کا لحاظ نہیں رکھا اور اپنے ذاتی اغراض کے پیچھے ملت کے انجام پر نظر نہیں ڈالی۔

جو قومیں دوسروں کی محکوم ہیں ان کا انتشار تو اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ان کے اعمال سے صلاحیت مفقود ہو گئی ہو ادھر کم سے کم دو سو سال کے کارناموں پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود کوششوں اور قربانیوں کے بھی کامیابیوں کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہو سکا۔ مراکش سے لے کر دیوار چین تک کتنے ہنگامے اُٹھے۔ اور کتنے مجاہدانہ معرکے ہوئے۔ مگر ہر ایک میں نقصان ہی اُٹھانا پڑا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُمت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور کوئی مرکز نہیں ہے جو اس کی قیادت کرے تاکہ اس میں عمل صالح کی حرکت پیدا ہو

ہندوستان کے متعلق میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اس کی حالت خود آپ کے سامنے ہے۔ یہاں تو نو کروڑ کے قریب مسلمان آباد ہیں مگر اجتماعی زندگی کا نام تک نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم دن بدن ہر لحاظ سے گرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ کوئی راہ نہیں جس پر سب متفق ہو کر چلیں کوئی کام نہیں جس کو سب مل کر کریں جمود اور تعطل کی زندگی ہے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

ذہنی تشتت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے صرف ایک کتاب لے کر آئے تھے یعنی قرآن کریم جس پر عمل کر کے صحابہ کرام نے دینی اور دنیاوی سربلندی حاصل کی۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنا عمل اسی کتاب پر رکھا اور اُمت کو اس سے ہٹنے نہ دیا جس کی وجہ سے ان کے زمانوں میں کوئی مذہبی فرقہ پیدا نہ ہو سکا اور ساری ملت متحد رہی

عہد بنی اُمیہ میں جب استبداد کا تسلط ہوا تو خلفائے دُنیا کو لے کر دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء کے حصہ میں آگئی۔ اسی وقت سے اختلافات پڑنے لگے، اور شخصیت پرستی کی وجہ سے نت نئے فرقے بننے شروع ہو گئے۔ عباسی عہد میں فقہا میں اختلاف واقع ہوئے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کے پیروؤں کی ٹولیاں الگ الگ ہونے لگیں۔ اسی زمانہ میں علوم عقلیہ کے تراجم ہوئے۔ اس وقت سے اختلافات روایات

وتاویلات کے باعث یہ ذہنی تشتت اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ ایک ہی ملت میں ۷۳ فرقے بن گئے جن میں سے ہر ایک اپنے ہی کو ناجی سمجھنے لگا۔ اور دوسروں کو ناری۔ اس طرح پر ملت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اُمت اسلامیہ کو دو عظیم الشان نعمتیں ملی تھیں۔ ایک قرآن کریم، دوسری امامت کبریٰ یعنی مرکزیتِ اُمت جس کو آپ نے نصب فرمایا تھا۔ ملوکیت نے مرکزیت کو فنا کر دیا اور اشخاص پرستی نے قرآن متروک ومہجور کر دیا جس سے دنیاوی اور دینی دونوں لحاظ سے اُمت میں لامرکزیت پیدا ہو گئی۔ اور یہی زوال کا باعث ہوئی۔

مستقبل اُمت کی آئندہ صلاح وفلاح کی صورت صرف یہی ہے کہ لامرکزیت چھوڑ کر وحدت کی طرف آئے، یعنی رفتہ رفتہ مسلمانوں کا مرکز ایک ہو جائے۔ جہاں سے ملت کے اجتماعی مقاصد کی تعیین اور ان کو عمل میں لانے کی تشکیل ہو اور دینی مرکز قرآن کریم ہو تاکہ ہر قسم کی فرقہ بندی مٹ جائے اور سب کے سب متحد ہو کر ایک راستہ پر گامزن ہوں۔

حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد مسلم اقوام نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور ان کے پیش نظر نہ صرف ملت کا اتحاد عمل ہے۔ بلکہ مرکزیت کا نصب کرنا بھی مقصود ہے۔ اس لئے اُمید ہوتی ہے کہ شاید ان عروق مردہ میں پھر زندگی کا خون دوڑنے لگے۔ اور ساری اُمیدیں تو اللہ کے کرم اور رحم سے ہیں۔ جو افراد کی طرح ملت کے گناہوں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔

ہدیہ تشکر

اس دفعہ طلوع اسلام کے اندر حضرت علامہؒ کی جو تصویر شائع کی جا رہی ہے وہ اُس وقت اُتاری گئی تھی جب آپ مسلمانوں کی عظمتِ گذشتہ کی یادگار۔ اُندلس کی جامع قرطبہ میں مصروف نماز تھے۔ قرطبہ کی مسجد اور — اقبال — گویا مسلمانوں کے مادی اور روحانی ارتقاء کے دو درخشندہ ستارے ہیں جو حُسن اتفاق سے یکجا ہو گئے ہیں۔ ہم اس نادرۂ روزگار تصویر کے بلاک کے لئے انٹر کالجیئٹ مسلم برادرھڈ کے بہ صمیم قلب شکرگذار ہیں + طلوع اسلام)

جمیعۃ عُلماءِ ہند کا اجلاس دہلی

مارچ کے پہلے ہفتہ میں جمیعۃ عُلماءِ ہند کا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہونیوالا ہے اس اجلاس کی اہمیت کے متعلق ناظمِ جمیعت، مولانا احمد سعید صاحب نے اعلان فرمایا ہے کہ :-

یہ اجلاس اپنی خصوصیت اور نوعیت کے اعتبار سے جسقدر اہم ہے اسکے عرض کرنیکی ضرورت نہیں ہے، اہل علم کا جو استخفاف اس نازک دَور میں ہو رہا ہے اسکی نظیر تلاشِ بسیار کے باوجود مشکل ہے، عُلماء کی تحقیر و توہین کا ارتکاب خود مُسلمان ہی کر رہے ہیں اور لطف یہ ہے کہ مذہب کا نام لیکر اہل مذہب کی تذلیل کیجا رہی ہے۔ کسی مذہبی یا سیاسی مسئلہ میں اختلاف اور باہمی افہام و تفہیم کا دستور ہمیشہ رہا ہے اور اس کو کسی وقت بھی مذموم نہیں سمجھا گیا۔ لیکن جو طریقہ سب و شتم کا آج اختیار کیا جا رہا ہے اور جس کو امتحان کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے یہ طریقہ اسوقت خواہ کتنا ہی فریبِ نظر اور مرغوبِ قلب کیوں نہ ہو لیکن اسکا نقصان مستقبل قریب میں جو پہنچنے والا ہے اسکا اندازہ اسوقت کرنا مشکل ہے، علماءِ مذہب اور عُلماءِ اُمّت کی سیادت کو ختم کر دینا ہمیں بھلا اور اچھا معلوم ہوتا ہے ......" (انصاری مورخہ ۱/۳۹ ۱۹)

یعنی اجلاس کی اہمیت اِس چیز کے پیشِ نظر نہیں کہ آج ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ جس موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسکا کوئی حل سوچا جائے، قوم تشتت و افتراق کی جس غیر اسلامی زندگی کی لعنت میں مبتلا ہے اسکا مداوا تلاش کیا جائے۔ نو کروڑ فرزندانِ توحید جس لامرکزیت اور انفرادیت کے دَورِ جاہلیت سے گزر رہے ہیں۔ اُسکی جگہ اپنی خالص اسلامی اجتماعیت اور مرکزیت کے قیام و بقا کی کوئی تجویز کیجائے۔ ان میں سے کوئی چیز اِس اجلاس کی محرک نہیں محرک ہے تو یہ جذبہ کہ علماء کی سیادت خطرہ میں ہے۔ ان کی عظمت و بلند مرتبت چھن رہی ہے۔ اِنکا وقار ختم ہو رہا ہے،

اسلیئے دعوت دی جاتی ہے کہ یہ حضرات ایک جگہ جمع ہوکر سر جوڑکر بیٹھیں اور سوچیں کہ اپنی سیادت و قیادت کا تحفظ کس طرح کیا جائے۔

جہاں تک سب وشتم کا تعلق ہے اسے کوئی شریف آدمی بھی بنظرِ استحسان نہیں دیکھ سکتا اور ایک مسلمان کے نزدیک تو دوسرے مسلمان کو ہدفِ سب وشتم بنانا ارشادِ نبوی کے مطابق فسق ہے۔ لیکن ہم ان علماء حضرات کی خدمت میں نہایت ادب سے گزارش کرینگے کہ وہ کبھی ٹھنڈے دل سے اس چیز پر بھی تو غور کریں کہ وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر آج ملّتِ اسلامیہ کی نگاہوں سے اِن حضرات کا وقار کم ہو رہا ہے، وہ کیا اسباب ہیں جنکے تحت وہی مسلمان جو حضرات علمائے کرام کی کفش برداری کو سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے آج اُن سے یوں برگشتہ ہو رہے ہیں یہ حضرات اِس چیز کو سوچیں اور غور کریں کہ بالآخر

وہ زمانہ کیا ہوا جب میرے گریہ میں اثر تھا ۔۔۔ یہی چشمِ خونفشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا

اِسوقت تو گنجایش نہیں، ہم انشاء اللہ آئندہ پرچہ میں کسی قدر تفصیل سے بیان کرینگے کہ علماء حضرات کا کیا فریضہ تھا اور اُنہیں اس فریضہ کی ادائیگی کس صورت میں کرنی چاہیئے تھی۔ ملّتِ اسلامیہ کے سامنے آج وقت کی سب سے اہم ضرورت کیا ہے اور اسکا حل کیا تجویز ہو سکتا ہے حضرات علماء کرام کی کھوئی ہوئی سیادت اُنہیں پھر سے کیسے واپس مل سکتی ہے اور وہ کس طرح مسلمانوں کو اس نہج پر لا سکتے ہیں جو کتاب وسنت نے ان کے لیئے متعین کیا ہے، اِسوقت ہم اِن حضرات کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرینگے کہ وہ ہنگامی جذبات ومحرکات سے متاثر ہونے کے بجائے مستقل حقایق اور بنیادی مسائل کو اپنے غور وفکر کا محور بنائیں اور یوں اپنی امامت کا جیتا جاگتا اور زندہ ثبوت دیں۔

طلوعِ اسلام کا
مسلک

(۱) طلوع اسلام کا مقصد و نصب العین حضرت علامہ اقبالؒ کے پیامِ حیات بخش کی اشاعت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کیا جائے +

(۲) مفکرین عالم کے سامنے یہ حقیقت پیش کی جائے کہ عالمگیر امن و فلاح کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ دنیا کا نظامِ زندگی وہ ہو جو خدا کے اس ضابطۂ حیات میں مرتب و مکمل ہے جس کا نام قرآن حکیم ہے

(۳) تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کیا جائے کہ دنیا علم و بصیرت اور ترقی کی جن بلندیوں تک چاہے پہنچ جائے قرآن کریم اس سے آگے ہی نظر آئے گا

نظام

(۴) طلوعِ اسلام کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں بلکہ تمام امّتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے۔

(۵) اسکا نظم و نسق ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہے جس نے محض اللہ کے لیے اس بار کو اٹھایا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ طلوعِ اسلام کے خسارہ کو پورا کرتے رہینگے مگر اسکے منافع میں سے کوئی رکن ایک پائی بھی اپنے لیے جائز نہیں سمجھے گا +

(۶) ہر وہ دردمند مسلمان جو اس جماعت کی تقویت کا آرزومند ہو مبلغ ۲۵/- روپیہ سالانہ کا عطیہ بکمشت یا بالاقساط ادا فرما کر حلقۂ معاونین میں شامل ہو سکتا ہے۔ چونکہ رسالہ کے اجرا کا مقصد پیغامِ خداوندی کی عام اشاعت ہے اس لیے خریداروں کی تعداد سے کہیں زیادہ پرچے ایسی جگہ مفت بھیجے جاتے ہیں جہاں اس پیغام کا پہونچانا نہایت ضروری ہے اور وہ ہنوز از خود اس تک پہنچنے کی تڑپ یا استطاعت نہیں رکھتے نیز رسالہ کے اہم مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر کے مفت یا محض لاگت پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

وَمَا توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم

(دائرہ طلوع اسلام بلیماران دہلی)

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

مطبوعات دائرہ طلوع اسلام

الحمدللہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ وارد ھا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے۔ گفتگوئے مصالحت دو بار طبع کرائی گئی اس طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ انکا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہونچتا۔ بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجیے۔ قیمت ۴ر محصول ڈاک ۱ر

وارد ھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

(از جناب رازی) اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہو رہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے۔

قیمت مع محصول ۱۰ر

سوراجی اسلام

(از جناب رازی) سیاسیات ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جس نے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کر دیا ہے، الہلال کے دور اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کانگریسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲ر محصول ۱ر

زبان کا مسئلہ

(از جناب رازی۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اردو کو تباہ کرکے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنا رہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اردو کو برباد کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کر رہے ہیں قیمت ۱ر علاوہ محصول

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi. Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office, Delhi.